تفہیم و تجزیہ
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی

کُلیّۂ علومِ اسلامیہ و شرقیہ جامعۂ پنجاب لاہور

ضابطہ

کتاب	:	تفہیم و تجزیہ (تحقیقی و تنقیدی مضامین)
مصنف	:	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
ناشر	:	پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی' لاہور
بہ اہتمام	:	القمر انٹر پرائزرز' اردو بازار' لاہور
مطبع	:	آر آر پرنٹرز' لاہور
اشاعت	:	۱۹۹۹ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۰۰ روپے

انتساب:

رشید حسن خاں

کے نام

ترتیب

☆

لغزشوں اور غلطیوں کے باوجود، میں نئے تحقیق کرنے والوں کے کاموں کو نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ کام نہ کرنے میں ایک عیب ہے اور کام کرنے میں سو عیب، کتنا دل گردہ ہے ان نوجوان محققین کا، جو اس اصول سے ترساں نہ ہو کر کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر بے عیب کام کی کوشش میں گھلتے رہیں تو امکان یہ ہے کہ کوئی کام ہو ہی نہ سکے گا۔

گیان چند

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

اقوام کے علمی و تہذیبی ذوق اور معیار کا اندازہ ان کی جامعات اور وہاں ہونے والے علمی کاموں سے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں جامعہ پنجاب کو اپنی قدامت اور وسعت کے اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہاں کے اساتذہ اور محققین نے ہر دور میں علم و ادب کا چراغ روشن رکھا ہے اور آج بھی یہاں ایسے اساتذہ اور محققین کی کمی نہیں جو خاموشی کے ساتھ اور نمود و نمایش کی دنیا سے دور رہ کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ملک کے دوسرے اہل علم کی طرح یہاں کے اساتذہ کو بھی اپنے تحقیقی کاموں کی راہ میں چند در چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق کی دشواریاں تو اپنی جگہ، لیکن سب سے بڑی دشواری فن پاروں کی اشاعت کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ میں نے کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ کی ڈین کا چارج لینے کے بعد یہ چاہا کہ ممکن حد تک اساتذہ کی اس دشواری کا مداوا کیا جائے اور ان کا تحقیقی کام علمی دنیا کے سامنے آسکے۔ اس مقصد کے لیے کلیہ کے اساتذہ سے ان کے تحقیقی مسودات کی بابت معلومات حاصل کی گئیں جس کے نتیجے میں سینیارٹی کی بنا پر نامور محقق اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے مجموعۂ مضامین کو اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب پہلے پنجاب کے مختلف کالجوں میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور اب گذشتہ سترہ برس سے جامعہ پنجاب کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان کی متعدد علمی و تحقیقی تصانیف شائع ہو کر قبول عام کا درجہ پا چکی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ

مختلف قومی و ملی شخصیات اور بعض اہم ادبی موضوعات سے متعلق ان کے مقالات کا ایک انتخاب ہے جو خود انھوں نے کیا ہے۔

اس مجموعے کی سب سے اہم بات اس کا تنوع ہے اس میں آپ کو تاریخ، تحقیق اور تنقید تینوں کا امتزاج ملے گا۔ سفرنامے کا رنگ بھی موجود ہے اور ہاشمی صاحب کا محبوب موضوع اقبالیات بھی اس مجموعے کا حصہ بنا ہے۔

دعا ہے کہ ڈاکٹر ہاشمی صاحب آیندہ بھی اپنی اعلیٰ تحقیقی اور علمی و ادبی کاوشوں کے نتائج تشنگان علم و تحقیق تک پہنچاتے رہیں۔

جمیلہ شوکت
ڈین کلّیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ
جامعہ پنجاب، لاہور

حرفِ اوّل

زیرِ نظر منتخب مضامین کا عرصۂ تحریر گذشتہ ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض تو مختلف مذاکروں اور سیمی ناروں میں پیش کرنے کے لیے لکھے گئے (نمبر ۱، ۴، ۵، ۷) اور چند ایک مدیران جرائد کی فرمائش پر (نمبر ۲، ۶، ۹) دو مضامین [حیات ظفر علی خاں کا ایک ورق، اندلس کے سفرنامے] اسی برس لکھے گئے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ پرانے مضامین پر نظرثانی کی گئی ہے اور اضافے بھی۔

گو، اردو ادب اور ادبی نقد و تحقیق سے مؤلف کا تعلق ۳۰، ۳۵ برس پرانا ہے، اس کے باوجود راقم کسی اِدّعا کے بغیر ان مضامین کو طالب العلمانہ حیثیت سے پیش کر رہا ہے، البتہ قارئین کو ان کے بین السطور مؤلف کے ایک خاص ذہنی رویے، انداز فکر یا طرز احساس کا اندازہ ہو گا۔ یہی ان مضامین کی معنویت ہے۔

راقم، محترمہ پروفیسر جمیلہ شوکت صاحبہ (فیکلٹی ڈین) اور برادرم پروفیسر سہیل احمد خاں (صدر شعبۂ اردو) کا ممنون ہے، جن کی توجہ سے فیکلٹی نے، زیرِ نظر مجموعۂ مضامین کو اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل کیا۔ اسی طرح اپنے دوستوں، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور عبدالعزیز ساحر کا بھی شکرگزار ہوں جن کے مفید مشوروں سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

رفیع الدین ہاشمی
استاد، شعبۂ اردو
یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور

مضامین

سرسید، شبلی اور مغرب

جوادُ الدّولہ عارف جنگ، سید احمد خاں، اوائلِ عمر میں ایک نہایت قدامت پسند بلکہ قدامت پرست شخص تھے۔ ان کی ابتدائی تصانیف (جامِ جم: ۱۸۴۰ء، آثارُ الصّنادید: ۱۸۴۷ء، قولِ متین در اِبطالِ حرکتِ زمین: ۱۸۴۸ء، اور رسالہ راہِ سنت در رد بدعت: ۱۸۵۰ء) کے موضوعات اور ان کا آرائشی اسلوب سرسید کی ذہنی قدامت پرستی پر شاہد ہے۔ مذکورہ تصانیف سے ان کی طبیعت کے جوش، غلو، شدت اور انتہا پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے آئینِ اکبری (۱۸۵۵ء) پر مرزا غالب کی تقریظ اس لیے واپس کر دی کہ اس میں انگریزوں کی صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادوں کا ذکر تھا۔ انھیں غالب کا یہ انداز بھی پسند نہیں آیا:

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند [۱]

اس دور میں، ہرچند کہ وہ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں تھے اور انگریزوں سے وفادارانہ ربط ضبط بھی رکھتے تھے، مگر ذہنی طور پر ''سر سے پیر تک قدامت پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے''۔[۲]

۱

۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بہت سے دوسرے ہندستانیوں کی طرح، انھوں نے بھی انگریزی غلبے کو ''خدا کی مرضی'' سمجھ کر قبول کر لیا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر، وہ انگریزوں کی وکالت بھی کرنے لگے۔ ان کی ذہنی

تبدیلی کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے رسالہ اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء) کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض دیگر تحریروں میں بھی وہ بہت نمایاں طور پر انگریزوں کی طرف داری کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے نواب محمود خاں کو "نامحمود خاں" اور بہادر شاہ ظفر "معزول کم بخت بادشاہ" قرار دیا۔ تحریک آزادی کے دیگر مجاہدین کو سرسید نے بہت برے الفاظ سے یاد کیا۔ [۳] ان کا یہ خیال روز بہ روز پختہ ہوتا گیا کہ انگریزوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قربت و یگانگت ہی سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

سفر انگلستان (۱۸۶۹ء) مغرب سے ان کی مرعوبیت کے لیے سونے پر سہاگا ثابت ہوا۔ قیام انگلستان کے زمانے میں انھیں لندن "بہشت" محسوس ہوا' اور وہاں کے لوگ "بااخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور"۔ محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسید نے لکھا کہ اگر انگریز اپنے مقابلے میں ہندستانیوں کو' "مثل جانور کے" [۴] سمجھتے ہیں' تو یہ غلط نہیں۔ لندن میں سرسید کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ ان کا طرز عمل بھی مؤدبانہ اور نیاز مندانہ تھا۔ ملکہ کے دربار میں حاضری دینے گئے تو وہاں انھوں نے: "بھی مثل تمام درباریوں کے' اپنے نمبر پر سامنے جا کر سلام کیا--- [اور] ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر' اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا"۔ [۵] وزیر ہند نے ایک خاص تقریب میں انھیں اپنے ہاتھ سے "سٹار آف انڈیا" کا تمغا پہنایا۔ ملکہ نے سی ایس آئی کا خطاب بھی عطا کیا۔ محسن الملک کے نام ایک خط میں فخریہ لکھتے ہیں: "اب میں احباب کی دعا سے سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی ہو گیا ہوں"۔ [۶] ان کے دل و دماغ پر اس غیر معمولی قدر و منزلت کا خاصا گہرا اثر ہوا۔ انگریزوں سے وفاداری کے جذبات مزید پختہ ہو گئے۔ انگلستان کے سترہ ماہی قیام کے بعد' واپس ہندستان پہنچے تو: "ظاہری وضع قطع کی طرح' ذہن اور فکر کے اعتبار سے بھی اب وہ ایک نئے انسان تھے"۔ [۷]

انگلستان سے واپس ہندستان پہنچ کر انھوں نے "لندن کے پیغمبروں اور سویلزیشن کے دیوتاؤں" (یعنی سٹیل اور ایڈیسن) کی تقلید میں تہذیب الاخلاق جاری کیا' جس کا مقصد ہندستانیوں کو "کامل درجے کی سویلزیشن" سکھانا تھا۔ اپنے ہمہ گیر اصلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے تہذیب الاخلاق کے اجرا (۱۸۷۰ء) کے بعد' ۱۸۷۵ء

میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور اگلے سال ملازمت سے پنشن لے کر خود کو مدرسے کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی تمام تر اصلاحی اور تعلیمی کاوشوں کا مقصد مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا' جو از روے مذہب تو مسلمان ہو' مگر بہ اعتبار ذوق و ذہن اور قلب و دماغ انگریز ہو۔ ان کے خیال میں ''اعلیٰ درجے کی تربیت اور شایستگی انگریزوں کی تقلید ہی سے ممکن ہے۔[۸]

سرسید احمد خاں نہایت نیک نیتی کے ساتھ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں' مغربیت کی راہ اپنائیں اور انگریزوں کی وفادار رعایا بن کر رہیں۔ بہ الفاظ سید سلیمان' سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔[۹] برطانوی حکومت کی بقا اور اس کا استحکام سرسید کی پر خلوص راے میں مسلمانوں کے لیے نہایت مفید اور سودمند تھا۔ اس ذہنی روش نے قدرتی طور پر سرسید کو عقل پرست بنا دیا۔ انھوں نے عقلی نقطۂ نظر سے مذہب کی تعبیر و تفسیر کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یوں سیاسی سوچ اور مذہبی تفسیر' ہر دو اعتبار سے وہ مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو گئے۔ ذہنی اعتبار سے سرسید کا یہ روّیہ مغرب کے سامنے کامل اطاعت گزاری (complete surrender) کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲

مولوی محمد شبلی نعمانی' اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر علی گڑھ پہنچے تو ان کی عمر ۲۶ سال تھی۔ سرسید احمد خاں ۶۷ برس کے تھے۔ انھوں نے اس نووارد نوجوان سے وہی سلوک کیا' جو ایک شفیق باپ کو ایک عزیز اور ہونہار بیٹے سے کرنا چاہیے۔ ابتدائی ایام میں شبلی شہر میں رہتے تھے اور ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ سواری پر اٹھ جاتا تھا۔ سرسید نے ان کی رہائش کا انتظام اپنی کوٹھی کے احاطے میں کر دیا۔ ایک وقت کے کھانے پر وہ عام طور پر شریک ہوتے تھے۔[۱۰] روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔[۱۱] المامون اسی دور کی تصنیف ہے۔ شبلی نے اس کے آغاز میں ''فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ

تاریخی نتائج کے استنباط" کو "علم تاریخ کی جان اور روح" قرار دیا ہے۔ یہاں واضح طور پر وہ سرسید سے متاثر نظر آتے ہیں۔

شبلی کو، سرسید احمد خاں کے ہاں اُن کے نادر کتب خانے سے استفادے کا موقع ملا۔ یہ کتب خانہ، یورپ، مصر، شام اور ترکی کی مطبوعہ ایسی نادر کتابوں پر مشتمل تھا جنھیں دیکھ کر: "علم و فن کی ایک نئی دنیا اُن کے سامنے نمودار ہوئی"۔ ۱۲؎ اس دور کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نعمت غیر مترقبہ کے میسر آ جانے سے، شبلی خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھنے لگے تھے۔ لکھتے ہیں:

"سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیۂ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت [میں] میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں۔ گبن صاحب کی تاریخ [Decline and Fall of the Roman Empire] جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھے سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے"۔ ۱۳؎

سرسید کے کتب خانے میں: "شبلی کو وہ کتابیں پڑھنے کو ملیں جن کا شبلی نے ابھی تک نام بھی نہ سنا تھا"۔ ۱۴؎ ان کی شب و روز کی صحبت، اور ان کے نادر کتب خانے سے استفادے نے شبلی کے مورخانہ رجحان کو جلا بخشی۔ سرسید کے ہاں انھیں: "وہ سامان تحقیق میسر آیا، جس نے ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے"۔ ۱۵؎

بہ قول شیخ محمد اکرام: "سرسید نے شبلی کی، اس علم کی طرف راہنمائی کی، جو آج ان کا تاج فضیلت ہے یعنی علم تاریخ و سیرت نگاری" ۱۶؎۔ شبلی کا ذوق تاریخ بڑی حد تک سرسید کے فیضان و اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان کا حسب ذیل بیان ایک اعتبار سے، اسی فیضان کا اعتراف ہے:

"ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں، جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں، جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے،

بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا ہے' تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے"۔ [۱۷]

سرسید احمد خاں کی وفات پر شبلی نے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا:

تزعزعت ارکان الملة ..... وتفرق شملنا ۔ انی لا اقدر علی ان اشتغل بشئی الا بعد برهة من الزمن ۔ [۱۸] (قومی عمارت کے ستون ہل گئے ..... ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا)۔

تأسف و تعزیت کا یہ انداز سرسید سے شبلی کے تعلقِ خاطر اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔

۳

علی گڑھ تحریک کو ایک نظام شمسی مانا جائے تو سرسید احمد خاں' اس نظام میں سورج کی حیثیت رکھتے ہیں' جن سے تمام وابستگان تحریک کسبِ فیض کرتے اور مُستَنیِر ہوتے نظر آتے ہیں۔ سرسید کی مغرب زدگی کا اثر' کم و بیش اُن کے تمام رفقا پر ہے۔ حالی ہوں یا ذکاء اللہ' چراغ علی ہوں یا محسن الملک؛ ذہنی مرعوبیّت سے کوئی بھی خالی نہیں' اور یہ مرعوبیت براہ راست یا بالواسطہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔ شبلی' جو سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور بہ قول شرر: "ان کی فوج کے ایک نامی گرامی پہلوان" [۱۹] سمجھے جاتے تھے' ان سب میں الگ نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں وہ بھی سرسید کی طرح انتہا پسند تھے۔ حُنفِیّت ان پر غالب تھی اور اس میں شدت تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں کی سَوا چودہ سالہ صحبت نے ان کے ذہن کو تبدیل کر دیا۔ وہ انتہا پسندی کی تنگ نالے سے تو نکل آئے' مگر بہ ایں ہمہ قربت و کسبِ فیض اور مداحی و عقیدت مندی وہ' سرسید کی راہ نہیں اپنا سکے۔ سرسید کی مغرب زدگی انھیں اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ شبلی' سرسید کی طرح دوسری انتہا پر نہیں گئے بلکہ اپنے توازنِ فکر و نظر کی بدولت' ایک معتدل ذہنی رویہ اختیار کر کے ایک علاحدہ راستے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

شبلی مغرب کے علمی مذاق اور مختلف علوم میں یورپی مصنفین کی وسیع معلومات اور

تحقیق میں ان کی مہارت کے قائل تھے۔ بلاشبہ مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون سے متعلق سیکڑوں نادر مخطوطات کی بازیافت کر کے انھیں مدون کیا۔ بہت سی نایاب کتابیں تصحیح کر کے شائع کیں۔ مسلم علوم پر انسائی کلوپیڈیا اور لغات تیار کیے۔ شبلی اس باب میں یورپ کی مجموعی خدمات کے معترف ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں یورپ کی خوش مذاقی اور علمی فیاضیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ [۲۰] مگر وہ ان کی کاوشوں کو "وحی ولایت" نہیں سمجھتے کیوں کہ مغرب میں بھی مستشرقین کی ایسی جماعت ہمیشہ سے موجود رہی ہے، جس نے دانستہ کذب و افترا اور تاویل و تعصب سے کام لیا، یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں کیں۔ [۲۱] بعض اوقات: "یورپین مصنفین ..... واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نتیجہ ان کے موافق نکلتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بہت سے ایسے راویوں سے استناد کرتے ہیں، جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور و معروف ہیں، لیکن دراصل ان کا کچھ اعتبار نہیں"۔ [۲۲] اس لیے شبلی انگریزی مصنفین کی "پردہ دری" کی ضرورت محسوس کرتے تھے، تاہم مستشرقین اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں ان کا رویہ متوازن ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے بہ قول: شبلی "یورپ کے علوم و فنون کے مداح اور خوشہ چین تھے، مگر اندھے مقلد نہ تھے"۔ [۲۴]

شبلی بنیادی طور پر قدیم نظام تعلیم کی پیداوار تھے، مگر ان کا طرز فکر قدامت پرستی کا اسیر نہیں ہے۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی پر معقولات کا غلبہ تھا، اور وہ جدید علوم کو تحقیر و تضحیک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مسدس حالی کے جواب میں لکھی جانے والی مسدس عوالی سے مولانا چریاکوٹی کا متشددانہ اور قدامت پرستانہ رویہ واضح ہے۔ شبلی، انھی مولانا چریاکوٹی کے لائق اور ہونہار شاگرد تھے۔ ایسے شاگرد، جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔ مولانا کہا کرتے تھے: اَنَا اَسَدٌ وَّاَنتَ شِبلِیْ میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ۔ [۲۵] شبلی بھی معترف ہیں کہ: "میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں"۔ [۲۶] بہ ایں ہمہ شبلی اپنے استاد کی، لکیر کے فقیر ثابت نہیں ہوئے، بلکہ اپنے اجتہادی ذہن کو بروے کار لاتے ہوئے، انھوں نے قدیم و جدید کے بارے میں ایک متوازن رویہ اختیار کیا۔

شبلی سرسید کے مداح تھے۔ انھوں نے سرسید کے "پُرزور دست و قلم" ان کی

"بہادری" ان کی "جانبازی" اور ان کی "انصاف پرستی" کا اعتراف کیا، مگر سرسید ہی کی تعلیم کردہ "اجتہاد اور تقلید سے آزادی" کے سبق کی روشنی میں، وہ کسی "بڑے سے بڑے شخص یا نامور لیڈر یا رفارمر" کی رائے کو بھی اہمیت نہ دیتے تھے، کیوں کہ ان کے بہ قول: "ہم (مسلمان) وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے"۔ [۲۷]
سرسید کی جدیدیت اور تعلیم جدید کے بارے میں ان کا غلو شبلی کو کھٹکتا تھا۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم، انسان کو محض نوکری پیشہ بناتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"دنیا میں آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے، جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے۔ ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے اور نوکریاں۔ کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟"۔ [۲۸]

علی گڑھ کی ناکامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہماری قومی درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی"۔ [۲۹] اس کا سبب ان کے خیال میں یورپ کی تقلید محض تھی۔ ابن تیمیہ" پر لکھتے ہوئے شبلی نے ایک جگہ (غالباً طنزاً) لکھا ہے کہ: "ہمارے زمانے میں تو رفارمر ہونے کے لیے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے"۔ [۳۰] بہ ایں ہمہ جدید تعلیم کے بارے میں ان کی رائے محض یک رخی نہ تھی۔ وہ ایک خاص حد تک جدید تعلیم کی افادیت کے قائل تھے، اسی لیے انھوں نے ندوہ کی تعلیم میں "انگریزی یا یورپ کی کسی زبان کی لازمی تعلیم"، "زمانۂ موجودہ کے علوم و فنون" کی تدریس، اور "موجودہ زمانے کی ضرورتوں اور خیالات سے واقفیت" ضروری سمجھی۔ [۳۱]
شبلی کے نزدیک جدید تعلیم کا المیہ یہ تھا کہ وہ یک رخی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے ان کی یہ شکایت کچھ بے جا نہ تھی:

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی	یورپ ار گپ زند آں نیز مسلم باشد
حلّ ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی	شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد
از ابوبکرؓ و عمرؓ ہیچ بہ یادت ناید	گرمیِ بزمِ تو از سیزرِ اعظم باشد

در سخن بگزری از سیرت و شان نبویؐ   ہر چہ گوئی ہمہ از گفتہ ولیم باشد [۳۲]

علمی اور ذہنی و فکری سطح پر مغربیت کی مخالفت شاید اتنا مشکل کام نہ تھا، مگر سیاسی سطح پر انگریزوں کے استبداد کے خلاف آواز بلند کرنا ایک نازک مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سرسید کی پالیسی تو سو فی صد وفاداری کی تھی، مگر شبلی اس راہ کو نہ اپنا سکے۔ انھوں نے نثر میں تو نہیں، البتہ شاعری میں جہاں تہاں انگریزی استبداد اور حاکمانہ جبر و ظلم [۳۳] کے خلاف آواز اٹھائی۔ "شہر آشوب اسلام" (ہنگامہ طرابلس و بلقان) کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ شرانگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تاکے؟
یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک [۳۴]

شبلی کی شاعری کا ذکر آیا تو یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریزوں کی زیادتیاں ہوں یا ہندستان کی بے اعتدالیاں یا سیاسی جماعتوں کی ناہمواریاں، انھوں نے سب کو: "نشانۂ طنز بنایا ہے، لیکن اس طور کہ طنز میں ناواجب نشتریت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ شروع سے آخر تک ایک سنبھلی ہوئی کیفیت قائم رہی ہے"۔ [۳۵] شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں: "شبلی

ایک ذوجہتین ہستی تھے۔ انھوں نے صرف قدیم کی پاسداری نہیں کی، بلکہ وہ جدید کی مفید باتوں سے بھی مستفید ہونے کی کوشش کرتے تھے"۔ ۳۶ ایسی فضا میں، جب بہ قول مولانا عبدالماجد دریا بادی:

"عرش سے لے کر فرش تک، ذرے سے لے کر آفتاب تک، علم و عمل، معاشرت، اخلاق، عقائد کے دائرے میں کوئی شے ایسی نہ تھی، جو "صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو۔ ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور تھی۔ دانش فرنگ، حکمت مغرب، عقلاے فرنگ، اقبال سرکار، دانایان مغرب وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے دور مرعوبیت کی یادگار علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے، اور ہماری زبان و ادب کا گویا جزو ہو گئے"۔ ۳۷

شبلی نے اندھی اور کورانہ تقلید کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ علی گڑھ چھوڑنے کا باعث بھی یہی ہوا کہ وہ ہر بات میں انگریزوں کی تقلید کو ناپسند کرتے تھے۔ ۳۸ بہ ایں ہمہ ناپسندیدگی وہ کسی شدید رد عمل کا شکار نہیں ہوئے، اور انھوں نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھا۔

حالی کا یہ قول کہ: "ہم کو اب محکوم بن کر رہنا ہے" ۳۹ سرسید ہی کی صداے بازگشت ہے۔ اس کے برعکس شبلی سمجھتے تھے کہ ہم محکوم سے حاکم بھی بن سکتے ہیں:

"تاریخ اسلام میں جھانکو، دیکھو، ہم میں کیسے کیسے حاکم گزرے ہیں"۔

سرسید تقلید کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے مگر پیرویِ مغرب کے باب میں انھوں نے بالکل برعکس روش اپنائی اور سرتاپا مغرب کے مقلّد ثابت ہوئے۔ شبلی نے ایسی اندھی تقلید سے اجتناب کیا۔ بہ قول خورشید الاسلام: "شبلی کی زندگی توازن کی تلاش میں صرف ہوئی"۔ ۴۰ شبلی بھی مذہبی جوش، قومی حمیّت اور ملت کی خیر خواہی میں سرسید سے کم نہ تھے، مگر قومی ترقی کے جوش میں، انھوں نے ہوش کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھوں نے سرسید کی عقلیت کو معتدل بنایا۔ سرسید نے سطحی تبدیلیوں کے ذریعے وقتی علاج کرنا چاہا، اور مذہب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اس میں کانٹ چھانٹ اور تعبیر و تاویل کے ذریعے تجدیدِ قوم کا بیڑا اٹھایا۔ ملی نشاتِ ثانیہ کے لیے شبلی علمی بنیادوں پر ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے "جدید علوم کی مدد سے مذہب کی

حفاظت" کا اصول قائم کیا' اور یوں اُن کا مسلک' تجدیدِ قوم کے بجائے تجدید دین قرار پایا۔ شاعری میں علامہ اقبال نے اسی طریق کار سے روشنی حاصل کی اور نثری ادب میں ابوالکلام آزاد[۱۴۱] سید سلیمان ندوی' عبدالماجد دریا بادی' ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالحسن علی ندوی ہمیں اس معتدل عقلیت پسندی کے مسلک پر چلتے نظر آتے ہیں۔

حوالے اور حواشی

۱۔ قصائد و مثنویات فارسی (مرتبہ: غلام رسول مہر)' مجلس یادگار غالب' پنجاب یونی ورسٹی لاہور' ۱۹۶۹ء' ص ۱۷ (حصہ مثنویات)۔

۲۔ عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں' ایک سیاسی مطالعہ' مکتبہ جامعہ دہلی' ۱۹۷۷ء' ص ۲۶۔

۳۔ مثلاً: بدمعاش' بدذات' مفسد' نمک حرام' کم بخت اور حرام زادے' دیکھیے: تاریخ سرکشی ضلع بجنور' لائل محمڈنز آف انڈیا' اسباب سرکشیِ ہندستان بہ حوالہ: خود نوشت حیاتِ سرسید' مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری' جنگ پبلشرز' لاہور' ۱۹۹۳ء' ص ۱۲۵ تا ۱۲۸' ۱۴۱' ۱۷۱۔

۴۔ مکتوبات سرسید (جلد اول) (مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)' مجلس ترقی ادب لاہور' ۱۹۷۶ء' ص ۴۳۶۔

۵۔ الطاف حسین حالی: حیات جاوید' ترقی اردو بیورو دہلی' ۱۹۸۲ء' ص ۱۵۴۔

۶۔ حوالہ ۴' ص ۴۱۷۔

۷۔ حوالہ ۲' ص ۱۰۱۔

۸۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز: سرسید احمد خاں' مرتبہ: مولوی محمد امام الدین، گجراتی' مصطفائی پریس لاہور' ۱۹۰۰ء' ص ۴۴۔

۹۔ حیات شبلی: مکتبہ عالیہ لاہور' [۱۹۸۷ء] ص ۳۶۴۔

۱۰۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی' ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور' ۱۹۷۱ء' ص ۹۷۔

۱۱۔ عبدالحلیم شرر: مضامین شرر جلد سوم (حصہ اول) گیلانی بک ڈپو لاہور' س ن' ص ۲۵۹۔

۱۲۔ حوالہ ۱۰' ص ۸۲۔

۱۳۔ مکاتیب شبلی' اول (مرتبہ: سید سلیمان ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ' ۱۹۲۸ء' ص ۵۶ تا ۵۷۔

شیخ محمد اکرام کے نقل کردہ اقتباس میں لفظ "حقیقت" محذوف ہے، ص ۸۸۔

۱۴۔ حوالہ ۱۰، ص ۸۹۔

۱۵۔ خلیق احمد نظامی: سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۴۹۔

۱۶۔ حوالہ ۱۰، ص ۸۹۔

۱۷۔ مقالات شبلی، جلد دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۰ء، ص ۵۷۔

۱۸۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۲۷ء، ص ۲۶۱۔

۱۹۔ حوالہ ۱۱، ص ۲۶۱۔

۲۰۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی، جلد چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۵۶ء، ص ۱، ۲۹۔ جلد ہشتم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۴ وغیرہ۔

۲۱۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی، جلد ہشتم، ص ۳۳۔

۲۲۔ علامہ شبلی نے مستشرقین کی کوتاہیوں اور یورپ کی تنگ نظری کی جانب بہ کثرت اشارے کیے ہیں، دیکھیے: مقالات شبلی جلد پنجم، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۵ء، صفحات ۳۵، ۹۲، ۱۰۳، ۱۱۱۔ جلد ہشتم، ص ۳۵ وغیرہ۔

۲۳۔ حوالہ ۲۲، ص ۱۰۰۔

۲۴۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی نثر کا فکری و فنی جائزہ: مکتبہ کارواں لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۳۰۸۔

۲۵۔ حوالہ ۱۰، ص ۵۹۔

۲۶۔ حوالہ ۲۱، ص ۳۸۔

۲۷۔ حوالہ ۲۱، ص ۱۵۶۔

۲۸۔ حوالہ ۲۱، ص ۱۵۰۔

۲۹۔ حوالہ ۲۱۔

۳۰۔ حوالہ ۲۲، جلد پنجم، ص ۶۲۔

۳۱۔ حوالہ ۲۱، صفحات ۶۸، ۸۶، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۳۲۔

۳۲۔ بہ حوالہ: **نظام الملک طوسی** از محمد عبدالرزاق کان پوری۔ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۰۔ یہ اشعار **کلیات شبلی** ، فارسی (مطبع معارف اعظم گڑھ) میں موجود نہیں ہیں۔

۳۳۔ ۱۸۹۲ء میں بحری جہاز کے ذریعے ترکی جاتے ہوئے، شبلی کو اثنائے سفر میں انگریزوں کی حاکمانہ بدمزاجی کا تلخ تجربہ ہوا۔ اس نے شبلی میں شدید ردعمل پیدا کیا۔ یہ دلچسپ قصہ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے روایت کیا ہے، وہ اس زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ ان کا بیان ہے:
"مولانا جس کیبن میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک نیچے کا برتھ اُن کو ملا تھا، اور اس برتھ کے اوپر جو برتھ تھا، اس میں ایک انگریز سوار تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ وہ شخص جب نیچے اترتا تھا تو مجھے ایک ٹھوکر لگا کر جاتا تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر صبر کر لیتا تھا کیوں کہ جہاز انگریزوں کا، ہندستان انگریز کے بس میں، جہاز کے کل ملازمین انگریزوں کے ماتحت، اب میں لڑتا تو کس سے لڑتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو میں نے ایک بازار میں اپنے برابر چلتا ہوا ایک انگریز دیکھا۔ میں قصد کر کے اس انگریز کے بالکل قریب چلا گیا اور کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگا۔ موقع پا کر اس کو ایک دھکا دیا تو وہ شخص گرتے گرتے بچ گیا اور میں آگے بڑھ گیا اور دل میں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ نہ یہاں انگریزی حکومت ہے اور نہ انگریزی جہاز ہے۔ اس قوم کے ایک بدبخت آدمی کو دھکا دیا کہ کسی روز اسی طرح سے دھکا دے کر ہندستان سے ان کو نکالیں گے"۔ (**مقالاتِ یوم شبلی**، مرتبہ: خان عبیداللہ خاں، ص ۱۶۵)۔

۳۴۔ **کلیاتِ شبلی اردو**، (مرتبہ: سید سلیمان ندوی) اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۹۷، ۹۸۔

۳۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا: "شبلی کی سیاسی نظمیں" مشمولہ: **مقالاتِ یوم شبلی** (مرتبہ: خان عبیداللہ خاں) اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۶، ۱۲۷۔

۳۶۔ حوالہ ۱۰، ص ۱۲۔

۳۷۔ عبدالماجد دریابادی: **اکبر نامہ**، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۴ء، ص ۹۷۔

۳۸۔ معین الدین انصاری: **شبلی، مکاتیبِ کی روشنی میں**، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۷۔

۳۹۔ حوالہ ۵، ص ۱۷۔

۴۰۔ خورشید الاسلام : تنقیدیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۳۹۔ خیال رہے کہ خورشید الاسلام ان لوگوں میں سے ہیں، جو شبلی کے باب میں معاندانہ رویہ رکھتے ہیں، چنانچہ وہ "شبلی کی زندگی توازن کی تلاش میں صرف ہوئی" کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں: "یا یوں کہیے کہ تلف ہو گئی"۔ یہ تضاد ان کے پورے مضمون میں نمایاں ہے۔ شبلی کے اعترافِ عظمت پر ان کی آمادگی، مضمون میں جگہ جگہ نظر آتی ہے لیکن شبلی کی "مولویت" انھیں ہضم نہیں ہوتی، اور وہ بار بار طنز و تشنیع پر اتر آتے ہیں۔ خورشید الاسلام کا یہ مضمون شبلی کے بارے میں نام نہاد ترقی پسند ذہن کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

۴۱۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری لکھتے ہیں: "شبلی کے ایک اصل وارث ابوالکلام ہیں --- ایک دوسرے وارث اقبال ہیں"۔ (بہ حوالہ: شبلی ادیبوں کی نظر میں (مرتبہ: محمد واصل عثمانی) صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۶۲)۔

حسرتؔ موہانی کی شخصی عظمت

حسرتؔ موہانی کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کا یہ قول:

"تم آدمی ہو یا جن؟ پہلے شاعر تھے، پھر پالی ٹیشن بنے اور اب بنیے ہو گئے"۔ [۱]

کچھ بے جا نہیں ہے بلکہ اس میں حسرت کی زندگی کے تضادات کی طرف بڑا خوب صورت اشارہ ملتا ہے۔

حسرتؔ کی زندگی میں قدم قدم پر تضاد ملتا ہے۔ ان کی زندگی کا بیش تر حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزرا مگر ان کی شاعری پر نشاط و امید کا رنگ غالب ہے۔ ان کی ظاہری شکل و صورت سپاٹ اور بے رنگ سی تھی لیکن ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی شوخی اور آب و رنگ نمایاں ہے۔ وہ نہایت پارسا اور پابند صوم و صلوٰۃ شخص تھے۔ تیرہ بار حج کیا مگر شاعری کا ایک قابل لحاظ حصہ، ان کے اپنے بہ قول عاشقانہ، ضاحکانہ اور فاسقانہ ہے۔ [۲] انتہا درجے کے متدیّن اور قدامت پرست مگر خواتین کے پردے کے ایسے مخالف کہ اپنی اہلیہ کا پردہ بھی ختم کرا دیا۔ [۳] راسخ العقیدہ مسلمان، مگر سری کرشن "علیہ ِالرحمتہ" سے اظہار عقیدت کے لیے متھرا اور بندرابن جاتے تھے۔ [۴] سیاسی زندگی میں وہ ایک بے چین رُوح کی طرح ہمیشہ اپنا مسلک تبدیل کرتے رہے۔ ایک راسخ العقیدہ اور اپنے بہ قول conservative مسلمان ہونے کے باوجود، کمونزم کے پُرجوش حامی اور مبلغ تھے اور "غلبہ آئین سویت" کی پیش گوئیاں بھی فرماتے رہے:

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

ان سارے تضادات کا راز حسرتؔ کی طرفگی طبع میں پوشیدہ ہے۔ (اک طرفہ تماشا ہے، حسرتؔ کی طبیعت بھی)۔ اس طرفگی نے بہت رنگ دکھائے۔ صرف یہی نہیں کہ چکّی

کی مشقت کے ساتھ فکر سخن بھی جاری رہی بلکہ کبھی نیشنلسٹ ہوئے اور کبھی کمونسٹ، کبھی کانگریس کا ساتھ دیا اور کبھی مسلم لیگ کا، کبھی جرنلسٹ بنے اور کبھی کھدّر فروش، مگر ان تمام تر تضادات کے باوجود حسرت کے بے پناہ خلوص، نیک نیتی، استقامت، عزمِ صمیم، جرأت و بے باکی اور صداقت شعاری کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

بلاشبہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور غزل میں ان کی آواز صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ [ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیال ہے کہ حسرت کے [متذکرہ بالا] تضادات "بجائے خود جمالیاتی تخلیق کے زبردست محرک ہیں" [۵]] لیکن بہ ہرحال وہ دوسرے درجے کے شاعر ہیں۔ محض ان کی شاعری کو ان کی عظمت و شہرت کی بنیاد بنانا درست نہیں۔ [۶] ان کی عظمت کا راز، ان کی بے ریا اور کھری شخصیت، ان کے فقر و استغنا، اور اس درویشی و قلندری میں مضمر ہے جو کسی طرح کی شاہی و خسروی اور فغفوری کو خاطر میں نہیں لاتی۔

حسرت کے ہاں آزادی کامل کا بے پناہ جذبہ، دوران تعلیم ہی سامنے آتا ہے۔ کالج سے تین بار ان کا اخراج ہوا، مگر یہ کڑی سزا بھی آزادیِ وطن کے لیے ان کے آتشیں جذبے کو سرد نہیں کر سکی۔ اس زمانے میں جب بہ قول سلیم احمد: "سرسید نے انگریزوں کے لیے کلرک ڈھالنے کی فیکٹری بنائی تھی--- [اور] انگریزوں کے زیرِ سایہ انگریزوں کے دفتروں کے لیے انگریزی بولنے والے انگریز نما بابوؤں کی ڈھلائی کا کام--- زور و شور سے جاری تھا" [۷] حسرت نے وکٹوریا کالج، گوالیار میں ریاضی و عربی کی پروفیسر شپ ٹھکرا دی۔ [۸] جب ان کے متعدد ساتھی سرکاری ملازمت سے منسلک ہونے کے بعد اپنی ذہنی و علمی صلاحیتیں، انگریزی دفاتر کی فائلوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے، حسرت نے مستقبل میں معاشی آسودگی کے خواب دیکھنے کے بجائے آزادی کامل کو منزل مقصود بنایا اور ہر طرح کی مصلحت کوشی اور عافیت طلبی سے بے نیاز ہو کر انگریزی سامراج سے ٹکرانا پسند کیا۔ روزانہ ایک من گیہوں پیسنا یا آٹے کے ہر سیر کے بدلے پانچ بید کھانا تو خیر، کوئی بات ہی نہیں، حسرت تو جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے:

ہم قول کے صادق ہیں، اگر جان بھی جاتی
واللہ کہ ہم خدمتِ انگریز نہ کرتے

نادر و نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کی ضبطی اور کوڑیوں کے مول ان کا نیلام--- سالہا سال کی قید و بند --- گیہوں پیسنے کی مشقت --- بید کھانے کی ذلت --- عرصۂ دراز تک قید تنہائی کی اذیت--- ناکافی گندے لباس کی بدبو اور غلاظت--- پاؤں میں لٹکتی ہوئی زنجیروں کی جھنکار--- ناقص خوراک، غرض کوئی مشقت اور کوئی سزا، آزادی کے لیے اُن کے جوش و خروش اور ولولوں کو سرد نہیں کر سکی۔ تعجب ہے کہ ان ساری کڑی آزمایشوں کے باوجود، ان کی شاعری میں کسی طرح کی تلخی، جھنجلاہٹ یا مایوسی کا اظہار نہیں ملتا بلکہ ان کے پورے کلام پر ایک طرح کا نشاط آمیز اور اُمید افزا لہجہ غالب ہے۔ یہ حوصلہ، یہ وسعت ظرف اور سیرت کی یہ پختگی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

حسرت موہانی کا قول ہے:

"یقین یا عقیدہ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا"۔ [۹]

ان کی پوری زندگی اسی قول کی تفسیر نظر آتی ہے اور اسی قول کی صداقت پر استقامت نے ان کی شخصیت کو عظمت اور دل کشی بخشی ہے۔

حسرت نے بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت پائی تھی۔ ان کی بے پناہ قوت کار، باطنی توانائی اور مختلف النوع صلاحیتیں ایک دنیا کو منقلب کرنے کی آرزومند نظر آتی ہیں۔ اپنے انقلابی عزائم کی تکمیل کے لیے وہ مختلف سیاسی مسلک قبول و رد کرتے رہے۔ ان کی مضطرب اور بے چین شخصیت نے اپنی عمر طرح طرح کی آرزوؤں اور ارمانوں کی تکمیل میں بتا دی۔ ان کے ہاں تضادات کی موجودگی اور سیاسی شعور کی کمی کی یہی توجیہ ہے اور اُن کے تخلص کی نفسیات بھی: ؏

میں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرتؔ ہوں

اِس اعتبار سے اُن کے تضادات قابلِ بحث و اعتراض تو ہو سکتے ہیں مگر انھیں مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی سیاسی و سماجی صورت حال کے تناظر میں حسرت کی شخصی عظمت یوں بنتی ہے کہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں وہ تمام اخلاقی اور انسانی خوبیاں موجود ہیں جو ہمیں آج کے سیاست دان میں نظر آتی ہیں' نہ آج کے شاعر یا ادیب میں (الا ماشاء اللہ)۔ آج کا سیاست دان برسر اقتدار پارٹی میں شامل ہوتا ہے تو اس کی نظر وزارت یا سفارت کے ذریعے گوناگوں مفادات کے حصول پر ہوتی ہے۔ آج کی دنیاے سیاست' حیلہ و مکر و ریا کی دنیا ہے۔ حسرت نے آزادی کے لیے طویل اور جانکاہ جدوجہد کی بنیاد پر کوئی مفاد حاصل نہیں کیا بلکہ بہ طور رکن اسمبلی اپنی جائز قانونی مراعات سے بھی دست کش رہے۔[۱۰] آج کا شاعر روپے پیسے کی ترازو لیے' اپنے ہر شعر کو تول بیچنے کے لیے تیار نظر آتا ہے لیکن حسرت اپنی تنگ دستی اور فقر و فاقے کے باوجود مشاعرہ پڑھنے یا ریڈیو پروگرام کا جائز معاوضہ لینے سے بھی احتراز بلکہ انکار کر دیتے تھے۔[۱۱] انھوں نے اپنے مجموعے انتخاب حسرت (مرتبہ: جلیل قدوائی) کی پندرہ فی صد رائلٹی کی دائمی آمدنی جامعہ بک ڈپو' دہلی کو بخش دی۔[۱۲] مجموعی طور پر تو حسرت کی شخصیت علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

ان کی شخصیت کو دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی سراپا جدوجہد ہے اور زندگی بسر کرنے کا لطف' اسی جدوجہد میں عملی شرکت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ احساس ہمارے اندر انسانیت کے مستقبل پر بے پناہ یقین و اعتماد پیدا کرتا ہے۔

حسرت کی تمام تر خوبیوں کے باوجود' ہمیں ان کی عظمت میں غلو نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً: یہ کہنا کہ "ان میں وہ تمام باتیں پائی جاتی تھیں جو اقبال کے قلندر میں پائی جاتی ہیں۔ وہ اقبال کی اس اصطلاح کی زندہ مثال تھے"۔[۱۳] درست نہیں ہے کیوں کہ' اقبال کا قلندر تو اپنے فکر و خیال اور اعمال و افعال میں ایک متوازن شخصیت کا مالک ہے' بہ یک وقت بریشم و فولاد اور شبنم و طوفان کے اوصاف کا حامل' عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں کا نمایندہ اور عقل و عشق کا خوب صورت امتزاج' جب کہ حسرت کی بے

لچک شخصیت میں انتہا پسندی[۱۴-الف]، ایک حد تک تعصب اور واضح طور پر تضادات کی کارفرمائی تھی۔ مگر ان بشری کمزوریوں اور تضادات کے باوجود یہ شخص منافقت، مکاری، ریاکاری اور مادہ پرستی سے کوسوں دور تھا۔ حسرت کی شخصیت میں کسی طرح کی بناوٹ، تصنع یا کھوٹ نہ تھا۔ اپنے شخصی تضادات کے باوجود ان کی عظمت مسلم ہے۔

(نگار پاکستان، کراچی، مئی ۱۹۷۵ء۔ نظرثانی: مئی ۱۹۹۹ء)

حوالے اور حواشی

۱۔ شبلی کے اس قول کا پس منظر یہ ہے کہ حسرت نے سودیشی تحریک کو تقویت پہچانے کے لیے اردوے معلی میں مضامین لکھے۔ دورے کر کے لوگوں کو سودیشی اشیا استعمال کرنے کی ترغیب دلائی۔ علما سے فتوے حاصل کر کے انھیں مشتہر کیا۔ پھر ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے محلہ رسل گنج میں "موہانہ سودیشی سٹور" کے نام سے ذاتی دکان کھول لی، جہاں صرف سودیشی کپڑا ہی نہیں، ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں بھی ملتی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا شبلی کی سفارش پر سرفاضل بھائی، کریم بھائی سے قرض پر کپڑا خریدا۔ بعدازاں جب وہ علی گڑھ سے کان پور منتقل ہوئے تو بعض اہل ثروت کے تعاون سے دس لاکھ روپے فراہم کر کے مشن روڈ پر خلافت سودیشی سٹور قائم کیا جس کا افتتاح ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: **حسرت موہانی** از عبدالشکور، شاہ اینڈ کمپنی آگرہ، ۱۹۴۶ء، ص ۱۹، نیز: **حسرت موہانی، حیات اور کارنامے** از ڈاکٹر احمر لاری، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۹۳ تا ۹۵)۔

۲۔ اس ضمن میں دیکھیے: ڈاکٹر محمد محسن کا مضمون "حسرت کی غزل گوئی کا نفسیاتی پس منظر" مشمولہ: **جائزے**، پٹنہ ۱۹۸۷ء۔

۳۔ ڈاکٹر احمر لاری، کتاب مذکور، ص ۱۹۱۔

۴۔ روایت عبدالشکور: کتاب مذکور، ص ۳۸، ۳۹۔

۵۔ **حسرت کی شاعری**: آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۔

۶۔ "ان کی شہرت و عظمت کا دارومدار، ان کی عشقیہ شاعری پر ہے"۔ (پروفیسر آل احمد سرور:

مجموعہ تنقیدات ' الوقار پبلی کیشنز لاہور' ۱۹۹۶ء ' ص ۴۴۱)۔

۷۔ سلیم احمد: نئی نظم اور پورا آدمی ' ادبی اکیڈمی ' کراچی ' ۱۹۶۲ء ' ص ۸۵ ' اور ۹۴۔

۸۔ حوالہ ۴ ' ص ۱۴۔

۹۔ اردوئے معلی ' نومبر ۱۹۰۸ء ' ص ۱۲ ' ۱۳ ' بہ حوالہ: احمر لاری ' حوالہ ۱ ' ص ۸۹۔

۱۰۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر دہلی میں شاندار بنگلوں اور ہوٹلوں میں ٹھیرتے تھے مگر حسرت ایک پرانی مسجد کے حجرے میں قیام کرتے یا دفتر الامان (گلی قاسم جان) کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے۔ مزید برآں اس زمانے میں ہر رکن اسمبلی کو ۵۷ روپے یومیہ الاونس ملتا تھا ' حسرت نے یہ الاونس لینے سے انکار کر دیا اور احتجاج کیا کہ ارکان اسمبلی کے لیے روزانہ اتنی بڑی رقم لینا ' غریب عوام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ (جلیل قدوائی: نقوش شخصیات نمبر ' جنوری ۱۹۵۶ ' ص ۱۷۴)۔

۱۱۔ حوالہ ۱۰۔

۱۲۔ روایت: جلیل قدوائی ' حوالہ ۱۰۔

۱۳۔ پروفیسر عبدالسلام: تخلیق و تنقید ' اردو اکیڈمی سندھ ' کراچی ۱۹۶۷ء ' ص ۲۱۹ تا ۲۲۰۔

۱۴۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ وہ سودیشی تحریک کے زبردست علم بردار تھے۔ ایک بار موسم سرما میں کسی دوست کے ہاں شب باشی کا اتفاق ہوا۔ صاحب خانہ نے شب میں پلنگ پر کمبل رکھ دیا اور استراحت کے لیے اندر چلے گئے۔ حسرت نے دیکھا کہ کمبل ولایتی ہے۔ ان کی اصول پسندی نے اجازت نہ دی کہ کمبل استعمال کریں ' دوسری طرف اخلاق سے بعید سمجھا کہ میزبان کو بلا کر ' اوڑھنے کے لیے ' کوئی متبادل کمبل یا رضائی طلب کریں۔ ساری رات شدید سردی میں ٹھٹھرتے رہے مگر کمبل کو ہاتھ نہ لگایا۔ (حسرت موہانی از مظفر حنفی ' نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ' ۱۹۹۰ ' ص ۵۷)۔

یہ انتہا پسندی ہے ' مگر اصول پسندی اور استقامت کی ایک مثال بھی۔

حیاتِ ظفر علی خاں کا ایک ورق

مولانا ظفر علی خاں کی ۸۳ سالہ زندگی' ان کے راجپوتی خون اور آتشین و ہنگامہ خیز افتادِ طبع کی آئینہ دار تھی۔ اپنے عہد کی تاریخ و سیاست' تہذیب و معاشرت اور ادب و صحافت کے شعبوں میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ حد درجہ متدیّن' بے باک اور اپنی دُھن کے پکے تھے۔ ہر آن ایک ولولۂ تازہ سے سرشار' وہ ایک مہم جو شخص تھے جنھیں اپنی تگ و تاز کے لیے ہمیشہ' نئی وسعتوں کی تلاش و طلب رہتی۔

ظفر علی خاں شاعر بھی تھے' اعلیٰ درجے کے بدیہہ گو' ایک ماہر مترجم' شعلہ بیان مقرر اور ایک نڈر اور بلند پایہ صحافی' اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب منتظم بھی تھے۔

۱

۱۸۹۵ء میں بی اے کے بعد' وہ (بمبئی میں مقیم) نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہ ان کی عملی زندگی کا آغاز تھا۔ تقریباً ایک سال کے بعد' انھوں نے اپنے استاد مولانا شبلی کے مشورے اور ہدایت پر حیدر آباد دکن جاکر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ملازمت کی ابتدا فوج سے ہوئی اور انھوں نے زمرۂ شہسواران میں شامل ہو کر فنونِ حرب اور شہ سواری و نیزہ بازی میں نام پیدا کیا' مگر اپنی ہمہ گیر اور مہم جو طبیعت کی وجہ سے کسی ایک جگہ ٹکے نہیں رہے بلکہ یکے بعد دیگرے' ایک سے دوسرے شعبے میں منتقل ہوتے رہے۔ انھوں نے بہ یک وقت علمی و ادبی' اور عسکری و انتظامی شعبوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مختلف اوقات میں منتظم پیشی اور مترجم ہوم آفس' صدر مترجم محکمہ معتمدی عدالت و امور عامہ و کوتوالی' رجسٹرار مجلس وضعِ قوانین لیجسلیٹو کونسل اور اتالیق میر عثمان علی خاں رہے۔ منصبی فرائض کے علاوہ طرح طرح کے علمی و ادبی

مشاغل، شعری و ادبی تخلیقات، بعض انگریزی کتابوں کے تراجم اور رسالہ افسانہ اور دکن ریویو کی ادارت وغیرہ اس پر مستزاد۔ اس زمانے میں ریاست حیدر آباد میں غیر مقامی افراد کے خلاف رقابتوں اور سازشوں کا عنصر خاصا بڑھ گیا تھا، ظفر علی خاں بھی اسی کا شکار ہوئے۔ مجموعی طور پر انھوں نے حیدر آباد میں بارہ تیرہ سال تک مختلف النوع خدمات انجام دیں۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انھیں بھی دیگر تین اصحاب (مولوی عزیز مرزا، مولوی صفی الدین اور عبدالحلیم شرر) کے ساتھ حیدر آباد سے "خارج البلد" قرار دے کر ۲۴ گھنٹے، اور بہ روایت دیگر ۴۸ گھنٹے کے اندر، حدود ریاست سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ [1]

ظفر علی خاں کے اولین قیام دکن کے زمانے (۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۹ء) میں، حیدر آباد کی معروف موسیٰ ندی میں ستمبر ۱۹۰۸ء میں غیر معمولی طغیانی آئی۔ طغیانی کیا تھی، ایک "سیلابِ بلا" تھا، جس نے وسیع پیمانے پر ہلاکت و تباہی مچائی۔ نظام حکومت نے سیلاب زدگان کے لیے فوری طور پر شہر کے مختلف علاقوں میں لنگر خانے قائم کیے۔ ظفر علی خاں اس وقت مجلس وضع قوانین لیجسلیٹو کونسل میں رجسٹرار تھے۔ انھیں بھی، دیگر سرکاری ملازمین کی طرح، امدادی کاموں کے سلسلے میں طلب کر کے علاقہ افضل گنج کے لنگر خانے کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ یہ ایک اہم اور نازک ذمہ داری تھی جسے انھوں نے کمال خوبی و مستعدی اور لیاقت و قابلیت سے انجام دیا۔

حیاتِ ظفر علی خاں کا یہ ایک اہم باب ہے مگر ان کی سوانح سے متعلق بعض کتابوں میں تو سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں ملتا، [2] اور بعض کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ بہت مختصر اور تشنہ ہے اور تفصیلی کارگزاری کہیں نہیں بتائی گئی۔ [3] ذیل میں اس کی کچھ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۲

موسیٰ ندی حیدر آباد شہر کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً سیلاب آتے رہے، جن میں سے بعض تباہ کن ثابت ہوئے۔ ستمبر ۱۹۰۸ء [4] کا سیلاب خاص طور پر قیامت خیز تھا، بہ قول ظفر علی خاں:

قہر خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر
بن کر قضائے مبرم، موسیٰ ندی کا طوفاں [۵]

دکن کی مختلف تاریخوں میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ تذکرہ حیدر آباد کے مصنف رمن راج سکسینہ [۶] بتاتے ہیں کہ ستمبر کے آخری ہفتے میں زور و شور سے بارشوں کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں مختلف تالابوں کے پشتے ٹوٹ گئے اور سیلاب کی سطح مسلسل بڑھنے لگی۔ نئے اور پرانے شہر کا تین چوتھائی حصہ اور دونوں حصوں کو ملانے والے سارے پل زیر آب آگئے۔ قدیم فصیل کا ایک حصہ اور کئی پل تباہ ہو گئے۔ فلک بوس مکانات آن کی آن میں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے۔ لوگوں کو صورت حال سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔

ایک محلے میں دو ہزار آدمی پانی میں محصور ہو گئے، جو پانی میں ڈوب گئے یا سیلاب کی تیز رو کے ساتھ بہہ گئے۔ گھاس بازار کے محلے میں بھی تقریباً اتنے ہی لوگ ندی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تقریباً تین ہزار لوگ گوشہ محل کی فصیل پر چڑھ گئے تھے، تاکہ طغیانی کا نظارہ کر سکیں، لیکن وہ خود اس طغیانی کی نذر ہو گئے۔ محلّہ کولسہ واڑی میں ایک گھنے جھاڑ پر تقریباً پچاس افراد پناہ لینے کے لیے چڑھ گئے تھے۔ درخت تیز بہاو کا مقابلہ نہ کر سکا چنانچہ سب لوگ جھاڑ کے ساتھ بہتے چلے گئے۔ زیادہ تر اموات مکانات گرنے اور بہ جانے سے ہوئیں۔ ندی کے اترنے کے بعد موت اور تباہی کے دردناک آثار نظر آ جاتے تھے۔ کئی مسخ شدہ لاشیں ملبے میں دبی ہوئی تھیں۔ کچھ کیچڑ میں آدھی دھنسی ہوئی تھیں۔ ندی کے قریب واقع مکانات تقریباً بہ گئے تھے اور جو کچھ دور تھے وہ بھی منہدم ہو چکے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق، آبادی کا ایک مربع میل علاقہ ندی کے جانب شمال اور نصف مربع میل علاقہ جانب جنوب، طغیانی سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ ۱۹ ہزار مکانات منہدم ہوئے، تقریباً ۸۰ ہزار افراد بے گھر ہو گئے، اور تین کروڑ روپے کا مال و اسباب برباد ہو گیا۔ جانی نقصان کا اندازہ دس ہزار تا پندرہ ہزار کا تھا۔ جو لوگ موت سے بچ گئے تھے، ان پر ایک دہشت طاری تھی۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر اردو اور تلگو کے شعرا نے نظمیں اور گیت لکھے اور لوگ ان گیتوں کو ایک عرصہ تک گایا کرتے تھے۔ اس طغیانی کی

تباہ کاریوں سے متعلق طرح طرح کے خوف ناک واقعات، قصے کہانیوں کی طرح، سینہ بہ سینہ، عرصے تک دہرائے جاتے رہے۔ دکن کے معروف رباعی گو صوفی شاعر امجد حیدر آبادی اسی موسیٰ ندی کے کنارے رہتے تھے۔ اس طغیانی میں ان کا مکان اور ان کے اہل خانہ بھی بہہ گئے۔ وہ خود کسی طرح بچ گئے۔ ان کے متعدد اشعار میں طغیانی کا ذکر ملتا ہے۔[۷]

ظفر علی خاں نے بھی اس تباہی سے متاثر ہو کر "شور محشر"[۸] کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی۔ اس نظم سے موسیٰ ندی کی غیر معمولی طغیانی اور اس کے نتیجے میں، قرب و جوار کے باشندوں پر نازل ہونے والے مصائب و آلام کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نظم اہل حیدر آباد کی ہولناک بربادی و تباہ حالی کا نقشہ پیش کرتی ہے، ہم یہاں صرف اس کا ایک بند درج کر رہے ہیں:

واحسرتا، وہ صدہا گھر بار کا اُجڑنا — ہر نخلِ آرزو کا بنیاد سے اکھڑنا
وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا — کوہِ قضا کا سر پر پل بھر میں ٹوٹ پڑنا
دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا — سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا
وہ جسمِ بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا — وہ جانِ ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا
اس ہاتھ کا، نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی — بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا
ماں سے لپٹ لپٹ کر بچے کا وہ بلکنا — اور ضد سے اس کے سینے پر ایڑیاں رگڑنا
بچے کا ہاتھ آ کر پھر ماں سے چھوٹ جانا — زخم جگر کے ٹانکوں کا یک بہ یک اُدھڑنا
سب دل کے ولولوں کا پیوندِ آب کرنا — اک رات کی دلھن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا
وہ ڈوبتے ہوؤں کا، سب کو سلام کرنا — اور ان کی حسرتوں کا، جا کر دلوں میں گڑنا
تھا فتنۂ قیامت، اے سیلِ رودِ موسیٰ — من کر ترا مچلنا، بن کر ترا بگڑنا
شانِ جلالِ باری، قہر خدا کا نقشہ — ہر لہر کا بپھرنا، ہر موج کا اکڑنا

کیوں ساتھ ساتھ اپنے لے کر چلا نہ ہم کو
جو قافلہ چلا ہے سرِ منزلِ عدم کو[۹]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، سیلاب زدگان کے لیے متعدد لنگر خانے قائم کیے گئے تھے۔ ظفر

علی خاں لنگر خانہ محلہ افضل گنج کے مہتمم مقرر ہوئے۔ مختلف محکموں کے سرکاری ملازمین کی ایک ٹیم ان کی اعانت کے لیے بھیجی گئی تھی۔

۳

یہ لنگر خانہ ۲ رمضان سے ۱۶ رمضان ۱۳۶۶ھ تک کام کرتا رہا۔[۱۰]
رپورٹ (ص ۲) کے مطابق ۱۵ دنوں میں ۷۴۳۸۰، افراد کو کھانا دیا گیا (یعنی تقریباً ۴۹۵۸، روزانہ)۔ معاً بعد ظفر علی خاں نے اس کی رپورٹ لکھنی شروع کی، جو مسجد افضل گنج میں ۲۱ رمضان المبارک کو مکمل ہوئی۔ یہ رپورٹ محکمہ تعمیرات عامہ کے معتمد مولوی محمد فاضل غلام حسین موراج کی خدمت میں پیش کی گئی اور اس کی نقول ریاست کے دس اہم عہدے داروں کو بہ غرض اطلاع روانہ کی گئیں۔ بعدازاں اسے رپورٹ کارگزاری لنگر خانہ افضل گنج کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اس کا ذکر ظفر علی خاں پر لکھی جانے والی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ مطبع شمسی حیدر آباد دکن میں مطبوعہ یہ رپورٹ تیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس رپورٹ سے مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت کا ایک ایسا رخ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جو ان کے سوانح نگاروں کے ہاں خاطر خواہ انداز میں اجاگر نہیں ہو سکا۔ انھوں نے کمال لیاقت و قابلیت اور حسن تدبیر و تنظیم سے لنگر خانے کو چلایا۔ زیر نظر رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے، ظفر علی خاں کی شخصیت کے حسب ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱۔ وہ انتظامی امور کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت کی بنا پر کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا اور مختلف امور کی ایسی ترتیب قائم کی کہ تمام معاونین، والنٹیر اور کارکن پوری خوش دلی اور محنت سے کام کرتے۔ وہ خود کارکنوں کے ساتھ سات بجے صبح سے رات گیارہ بارہ بجے تک "علی التوالی والتواتر" مختلف کاموں میں مصروف رہتے، ایسی مصروفیت "جو مغز کو پکاوے اور حواس کو باختہ کر دے"۔ (ص ٦)
رپورٹ میں بتاتے ہیں کہ:

تمام کام تقسیم طعام کا، بیشتر ان والنٹیروں کے سپرد تھا، جو چار پانچ ہزار آدمیوں کو دو دقتہ فرداً

بسم اللہ خیر الاسماء

ز نظام الملک آصف جاہ سادس سایۂ ایزد | کہ جود بیدریغش خندہ برابر بہاران زد

دوام عمر و ملک او رعیت از خدا خواہد | کہ چرخ این سکۂ دولت بدور روزگاران زد

رپورٹ کارگزاری

لنگرخانہ افضلگنج

من ابتدائے ۲ رمضان لغایتہ ۱۶ رمضان سنہ ۱۳۲۶ھ

مرتبہ

ظفر علیخان بی۔اے

رجسٹرار مجلس وضع قوانین سرکار عالی و مہتمم لنگرخانہ افضلگنج

مطبوعہ مطبع شمسی حیدرآباد دکن

فرداً کھانا پہنچاتے تھے' اور اس کے علاوہ ہر شخص کی انفرادی ضرورتوں کے متعلق تفحص و تجسس کر کے مفصل رپورٹ میرے پاس پیش کرتے تھے--- یہ لوگ ایک مرتب اور باقاعدہ فوج کی طرح میرے احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے"۔ (ص ۶' ۷)

بیش تر کارکن رات بارہ بجے تک ظفر علی خاں کے ساتھ مصروف کار رہتے۔ رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ اسی محنت شاقہ کے نتیجے میں بعض لوگ علیل ہو گئے' مگر علالت کے باوجود برابر کام کرتے رہے۔ (ص ۷)

۲۔ ظفر علی خاں کے حسن انتظام کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مستحقین کی اعانت و امداد میں کسی طرح کا امتیاز روا نہیں رکھا۔ لنگر خانہ' افضل گنج کی مسجد میں قائم تھا' مگر اس کا دروازہ بلاامتیاز مذہب و ملت' ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر کھلا رہا۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خاص مسجد کے اندر ہنود کے متعدد خاندان مقیم رہ کر رسد پاتے رہے۔ چنانچہ ۲۱ رمضان المبارک کو' جب یہ رپورٹ زیر تحریر تھی' بلدیو پرشاد کا خاندان برآمدۂ مسجد میں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ بہ زمانہ قیام لنگرخانہ' صدہا ہندوؤں کو مسجد سے خشک رسد دی جاتی رہی۔ آٹھ سو ایسے بے خانماں ہنود کے نام دفتر لنگرخانہ میں درج تھے جنھیں "حضور پرنور کے شاہان بذل وجود کے تصدق میں" یہاں سے کئی دن تک رسد ملتی رہی۔ (ص ۱۴)

کرنل ڈاکٹر آرشور نے معائنہ کنندگان کی کتاب میں لکھا: "مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظفر علی خاں اس بات [کے] خصوصیت کے ساتھ آرزومند ہیں کہ ہندو مسلمان دونوں کو خوش رکھیں"۔ (ص ۲۶' ۲۷) جس دن لنگر بند ہوا' اس سے پہلے ایک شام' یعنی ۱۶ رمضان کو ظفر علی خاں نے علاقے کے ہندو مسلم دکان داروں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی۔ تقریباً دس ہزار لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے امدادی کاموں کے سلسلے میں اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر کیا' پھر:

"اس عام مصیبت و پریشانی کی کالی گھٹا کا نقشہ کھینچ کر' جو حیدر آباد کے مطلع پر آج کل چھائی ہوئی ہے۔ اور اس کے بعد--- اس روشنی کی طرف اشارہ کر کے جو تاجدار دکن مدظلہ' کی ذات ہمایونی کی وجہ سے اس تاریکی کو مبدل بہ نور کرنے کا یقین دلا رہی ہے' ہندوؤں اور

مسلمانوں کو آپس میں بغل گیر ہونے اور اپنے [کذا] متفقہ مساعی سے عروس البلاد حیدر آباد
کی اجڑی ہوئی رونق کو پھر اصلی حالت پر لانے کا سبق دیا"۔ (ص ۱۴، ۱۵)

ظفر علی خاں کی اس تقریر کی مزید تفصیل دستیاب نہیں، لیکن قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم شیر و شکر ہو کر رہنے کا مشورہ دیا ہو گا۔ کیوں کہ اول تو ریاست حیدر آباد کے مخصوص حالات اس بات کے متقاضی تھے، دوسرے "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اور "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا تصور ابھی خاصا قوی تھا، خاص طور پر ریاست حیدر آباد دکن میں، جہاں کا حکمران مسلمان تھا، مگر رعایا کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ بقاے باہم، دونوں کی ضرورت تھی۔

۳۔ ظفر علی خاں انسانی نفسیات سے بخوبی واقف تھے، ان کے حسن انتظام کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ اپنے معاونین اور کارکنوں سے ہمیشہ خوش دلی سے پیش آئے اور خود "افسر" یا "صاحب بہادر" بننے کے بجاے، انھی جیسا کارکن بن کر محنت و مشقت کے کاموں میں ان کے دوش بہ دوش کام کیا۔ مزید برآں ان کی کارکردگی کو سراہتے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔

زیر نظر رپورٹ میں وہ مختلف اصحاب کی تعریف کرتے، اور ان کی مستعدی اور تن دہی، خوش سلیقگی، غیر معمولی محنت، ایثار نفس، خلوص، انسانی ہمدردی، لیاقت، محنت، دیانت، جفاکشی اور شرافت کو سراہتے ہیں۔ چند ایک کارکنوں کے بارے میں انھوں نے بہت اچھے تاثرات کا اظہار کیا، مثلاً: خورشید مرزا کا ساجوان صالح، متین اور منتظم ہاتھ آنا دشوار ہے"۔ (ص ۷) محمد ادریس، جیسے سرگرم کام کرنے والے ہیں، اگر ۵ فی صد نوجوان بھی ہوں تو ہر مشکل سے مشکل کام بہ آسانی انجام پا سکتا ہے"۔ (ص ۸) بہ لحاظ مستعدی و جاں فشانی، سراج احمد صاحب کی خدمت سب میں نمایاں ہے (ص ۸)۔ مولوی محمد یٰسین خان، ان چند اشخاص میں سے ہیں، جن میں سے ایک، دس پر بھاری ہوتا ہے۔ (ص ۹) مولوی عبیداللہ صاحب طبقہ علماے کرام میں سے ہیں اور انھوں نے حَسبتاً لِلّٰہ اپنا سارا وقت اس کام کی نذر کر رکھا تھا۔ (ص ۱۲) بہ حیثیت مجموعی، وہ جملہ اصحاب کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں: "شاید یہ لنگرخانہ افضل گنج کی خوش قسمتی کا باعث تھا کہ تقریباً

جن جن صاحبوں کی خدمات یہاں سے متعلق کی گئیں، وہ سب نہایت اہل ثابت ہوئے"۔ (ص ۱۰)

۴۔ ظفر علی خاں نے اپنے معاونین اور کارکنوں کی داد و تحسین اور حوصلہ افزائی ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ رپورٹ میں نام بہ نام ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے متعلقہ محکموں کے حکام کو ان کارکنوں کی غیر معمولی کارکردگی، مستعدی اور محنت کی طرف متوجہ کیا۔ اگرچہ معاونین نے یہ خدمات کسی معاوضے کے لیے نہیں انجام دی تھیں، تاہم ظفر علی خاں نے سفارش کی کہ یہ سب لوگ صلے، انعام اور ترقی کے حق دار ہیں۔ ان میں سے جو کارکن بے کار اور متلاشیِ روزگار تھے، انھیں "حسن خدمت کے صلے میں کوئی خدمت [ملازمت] عطا فرمانے" کی درخواست کی۔ مولانا عبیداللہ نے اپنا سارا وقت خدمت خلق کے جذبے سے اس کام کی نذر کیا تھا۔ اب وہ اپنے وطن کابل جانا چاہتے تھے، رپورٹ میں کہا گیا کہ: "ان صاحب کی ان شبانہ روز کوششوں کا، جو خالصتاً لِوَجہِ اللّٰہ 'بلاامید معاوضہ، انھوں نے کیں، یہ صلہ ہو سکتا ہے کہ کلام مجید کا ایک نادر مطلا شاہ پسند نسخہ، جو ان کے پاس موجود ہے، سرکار عالی خریدے--- تو ایک مستحق شخص اپنی مراد کو پہنچ جائے گا"۔ (ص ۱۴) ظفر علی خاں نے خورشید مرزا جیسے "جوانِ صالح، متین اور منتظم" کو "ولایت کا اسکالرشپ عطا" کرنے کی سفارش کی تاکہ وہ اپنی تعلیم معدنیات کو مکمل کر سکیں۔ اس طرح ریاست میں "ایک قابل تر عہدے دار" کا اضافہ ہو گا۔ (ص ۷، ۸) نواب افتخار الملک وزیر کوتوالی اور تعمیرات عامہ کے رکاب کے جن سواروں نے لنگرخانے کے انتظام میں مدد دی تھی، انھیں بھی حسب مراتب الاونس دینے کی سفارش کی گئی۔ (ص ۱۸، ۱۹)

۵۔ برعظیم پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت میں اس طرح کے فرائض بالعموم "بہ کارِ سرکار" طرز پر انجام دیے جاتے ہیں اور "سرکاری ڈیوٹی" مکمل ہونے کے بعد عام طور پر مسئلہ رفت گذشت ہو جاتا ہے۔ ظفر علی خاں کو تفویض کردہ کام، بہ ظاہر ان کی "سرکاری ڈیوٹی" تھا، مگر انھوں نے اسے ایک کارِ خیر سمجھ کر جذبۂ خدمت خلق کے تحت انجام دیا۔ انھوں نے رپورٹ مکمل کر کے، اسے افسرانِ بالا تک پہنچانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس

بات پر بھی غور کیا کہ وقتی طور پر تو لوگوں کو روٹی اور کپڑے کی ضروریات مہیا ہو گئیں، اس کے بعد ان کی رہائش اور معاش کی کیا صورت ہو گی؟ اور اس ضمن میں حکومت ان کی کیا مدد کر سکتی ہے؟ اس وقت تک نقصانات کے اعداد و شمار محض تخمینوں اور اندازوں کی بنیاد پر مرتب کیے گئے تھے۔ آیندہ طغیانی سے پیدا ہونے والے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے منصوبہ بندی ضروری تھی، اور اس کے لیے امکانی حد تک ہمہ نوع، صحیح اور مکمل اعداد و شمار کی فراہمی ناگزیر تھی۔

ریاست کے معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ [ہوم سیکرٹری] مولوی محمد عزیز مرزا، ظفر علی خاں کے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں ظفر علی خاں کو ان کی تائید حاصل رہی۔ اس موقع پر ان کے مشورے سے، ظفر علی خاں نے اتلاف جان و مال کے اعداد و شمار فراہم کرنے کا ڈول ڈالا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک فارم تیار کیا، اسے ۴۰ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر، متاثرین سیلاب میں تقسیم کرایا۔ اس رپورٹ کے لکھتے لکھتے، ان میں سے تقریباً ۱۵ ہزار فارم تو مرتب اور مکمل ہو کر ان کے پاس واپس آ گئے اور فارموں کی ایک بڑی تعداد علاقہ مجسٹریٹ صاحبان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ یہ کام جاری تھا اور ان فارموں کی مدد سے نہایت قیمتی معلومات جمع ہو رہی تھیں۔ ظفر علی خاں کا ارادہ یہ تھا کہ وہ ان مرتب شدہ فارموں کو مولوی محمد عزیز مرزا کے سپرد کر دیں گے تا کہ وہ ان کی بنیاد پر نظم مملکت کی، مختلف جہتوں میں، منصوبہ بندی کر سکیں۔ (ص ۱۷، ۱۸) رپورٹ میں دل چسپ بات یہ بتائی گئی ہے کہ ان فارموں کی طباعت پر صرف ۳۰۰ روپے صرف ہوئے۔ اگر یہی کام محکمۂ مردم شماری کے سپرد کیا جاتا تو شاید ہزارہا روپے خرچ ہو جاتے۔

۴

ظفر علی خاں کو جو ذمہ داری تفویض کی گئی تھی، وہ اسے اپنی خداداد لیاقت اور حسن تدبر سے انجام دینے میں کامیاب رہے۔ یہ خدمت ان کے لیے نیک نامی کا باعث ہوئی۔ رپورٹ لکھتے ہوئے خود ان کا دل، کامیابی اور تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس موقع پر

ان کے احساسات، ایک کامیاب بلکہ فاتح ٹیم کے کپتان یا بہ خیر و سلامتی ساحل سے آلگی کشتی کے ملاح سے مختلف نہ تھے۔ اس کا اندازہ رپورٹ کے آخری حصے کی حسب ذیل سطور سے ہوتا ہے:

"مجھے اس امر کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے [کذا] ناچیز خدمات کس قدر مفید یا غیر مفید، بہ حق رعایا و برایا ثابت ہوئے۔ افضل گنج گزرگاہ خاص و عام تھا۔ صبح سے شام تک اعلیٰ ترین ارکان مملکت سرکار آصفیہ سے لے کر ادنا ترین رعایائے سرکار عالی [تک] کی نگاہیں یہاں کے تمام جزوی و کلی انتظام پر تھیں۔ جو بار کام کا، یکایک اور فوری طور پر آپڑا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ اس کو ایک شخص تن تنہا اٹھا سکتا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ ڈگمگاتی ہوئی کشتی ساحل مراد پر پہنچ گئی اور ان قیمتی آرا نے، جن سے لنگر خانہ افضل گنج کی کتاب الآرا کو زیب و زینت حاصل ہوئی ہے، بادبان کا کام دے کر، اس ناؤ کو کنارے پہنچا دیا"۔ (ص ۱۷)

۵

رپورٹ میں مذکورہ بالا "کتاب الآرا" سے بعض آرا نقل کی گئی ہیں۔ ظفر علی خاں کے حسن انتظام اور ان کے معاونین کی بھرپور کارکردگی کا اندازہ لگانے کے لیے ذیل میں بعض آرا دی جا رہی ہیں۔ اس حصے کا عنوان ہے: "اراکین دولت اور دیگر معزز وزیٹروں کی آرا"۔

☆ مہاراجا سرکشن پرشاد شاد، مدار المہام:

"لنگر خانے کے منتظم ایک لائق نوجوان عہدے دار ظفر علی خاں--- کی جاں سوزی اور دل چسپی اور سعی اور ہمدردی لائق تحسین اور ان کے ماتحتین کی محنت قابل آفرین ہے---

روزانہ آپ کے پاس سے لنگر خانے کے پخت کا نمونہ آتا ہے، میں اس کو دیکھتا ہوں۔ اہل اسلام کے لیے جس قدر لنگر خانہ جات سرکار کی طرف سے معین کیے گئے ہیں، ان میں آپ کے لنگر خانے کے پخت و پز کا نظام اچھا ہونے کے سوا، غلہ بھی اچھا آتا ہے--- اس سے پایا جاتا ہے کہ آپ دل چسپی سے اپنے کام کو ادا کرتے ہیں جو لائق قدر اور باعث مسرت ہے"

(ص ۲۰' ۲۱)

☆ **نواب افتخار الملک بہادر' معین المہام کوتوالی :**

"کثرت پخت اور محتاجوں کی کثرت--- اس سے بہتر کیا انتظام ہو سکتا ہے' خصوصاً اس عالم پر آشوب و پریشانی میں آپ کا انتظام درست ہے"۔ (ص ۲۲)

☆ **مولوی محمد اکبر نذر علی حیدری' معتمد فنانس :**

"بچارے منتظمین کا چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا ہے لیکن پھر بھی وہ اس عظیم الشان خدمت سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں [اور اس خدمت کو وہ] چستی اور ایثار نفس سے انجام دے رہے ہیں"۔ (ص ۲۴)

☆ **مولوی محمد عزیز مرزا' معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ :**

"ہر طرح پر انتظام قابل تحسین ہے۔ کھانا اچھا پکتا ہے۔ تقسیم باقاعدہ ہوتی ہے اور صفائی کی حالت بھی اچھی ہے۔ جس قیمت پر غلہ خریدا جاتا ہے' وہ بہ مقابلہ دوسرے باورچی خانہ جات کے' گراں نہیں ہے اور برتن قلعی دار ہے۔ مولوی ظفر علی خاں اور ان کے مددگاران' خاص کر مولوی محمد جامع صاحب کی کارگزاری قابل قدر ہے"۔ (ص ۲۵)

☆ **مولوی محمد فاضل غلام حسین موراج' معتمد تعمیرات عامہ :**

"آپ لوگ کس قدر ایثار نفس سے کام لے رہے ہیں اور کیسی محنت کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں' اس کی نہایت قدر و منزلت میرے دل میں ہے--- تمام انتظام قابل اطمینان ہیں۔ صفائی کا نظام اچھا ہے"۔ (ص ۲۶)

☆ **کرنل ڈاکٹر آر شور' ناظم طبابت :**

"میں نے ایک دو بار لنگر خانہ افضل گنج کا معائنہ کیا جس کے انتظام میں مسٹر ظفر علی خاں نے نہایت قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ جو کام ان کے تفویض ہے وہ نہایت مشکل تھا' اس لیے کہ انھیں سب ہی طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا"۔ (ص ۲۶)

☆ **نواب ذوالقدر جنگ بہادر' رکن مجلس عالیہ عدالت :**

"مولوی ظفر علی خاں صاحب کا انتظام ہر طرح قابل تعریف ہے"۔ (ص ۲۷)

متذکرہ بالا اصحاب کے علاوہ بھی متعدد اصحاب (ڈاکٹر نواب ارسطو یار جنگ' مولوی سید عباس حسین' رائے ڈاکٹر نائڈو' نواب کمال یار جنگ' ڈاکٹر مرزا) نے باورچی خانے کی صفائی ستھرائی' خوش ذائقہ کھانے' خدمت گزاری میں کارکنوں کی غیر معمولی جاں فشانی اور تن دہی اور بہ حیثیت مجموعی انتظام کی عمدگی کو سراہا اور خصوصیت سے مولوی ظفر علی خاں کی "نمایاں قابلیت" کی تعریف کی۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ ظفر علی خاں کی کارکردگی کی تعریف و تحسین کرنے والوں میں محکمہ فنانس کے انگریز افسر مسٹر جی سی واکر بھی شامل تھے۔ ان کی رائے میں لنگر خانے کی انتظامی حالت اچھی نظر آتی تھی اور ظفر علی خاں نے "غیر معمولی جاں فشانی" سے کام لیا ہے۔ (ص ۲۳) خیال رہے کہ ریاستی محکموں میں مسٹر واکر کا بہت دبدبہ تھا۔ بعض اوقات اہل کاروں سے ان کا رویہ توہین آمیز ہوتا تھا' اس لیے کوئی شخص ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ ظفر علی خاں نے ان کے بارے میں "واکر نامہ" کے عنوان سے ایک ہجویہ نظم لکھ ماری' جس نے ہر طرف کھلبلی مچادی۔[۱۲]

"کتاب الآرا" میں ایک اہم رائے ریاست کے ایک انگریز عہدے دار مسٹر جے ایچ ڈیولن' مددگار معتمد فنانس کی درج ہے' وہ لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ مسٹر ظفر علی خاں اور ان کے قلیل القدر [کذا] مددگاروں نے برگشتہ [بخت] [۱۳] مصیبت زدگان طوفان میں کھانا اور کپڑا تقسیم کرنے کا جو انتظام کیا ہے' وہ ایسا ہے جس کی کافی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ دن رات میں بہ مقام افضل گنج ۱۸' ۱۸ گھنٹے محنت کرتے ہیں اور محنت شاقہ اکتوبر کی تپتی دھوپ میں انجام دی جا رہی ہے۔ میں [نے] آج دو لیڈیوں کے ہمراہ اس باورچی خانے کو آ کر دیکھا اور مسٹر ظفر علی خاں کو اپنے کام میں نہایت انہماک کے ساتھ [مشغول؟] پایا"۔ (ص ۲۷' ۲۸)

۶

لنگر خانے کے انتظام میں گندم' چاول اور باورچی خانے کی دیگر ضروریات کی خریداری' دو وقت کھانے کی پخت و پز' صبح و شام تقریباً ۵ ہزار حاجت مندوں میں کھانے

کی تقسیم، برتنوں اور مجموعی طور پر باورچی خانے اور لنگر خانے کی صفائی، پھر آمد و خرچ اور جملہ حسابات کی تفصیل رقم کرنے کے مختلف اور متنوع کام شامل تھے، جنھیں کامیابی سے انجام دینا آسان نہ تھا۔ خوراک کے ساتھ، مستحقین میں کپڑے اور پارچے بھی تقسیم کیے جاتے تھے۔ منتظمین خیال رکھتے تھے کہ کھانا اور کپڑے غیر مستحق لوگوں کو نہ دیے جائیں۔ لنگر خانے کے معائنے کے لیے صبح و شام حکومت کے مختلف عہدے داروں اور افسروں کی آمدورفت لگی رہتی تھیں۔ بعض اوقات متعلقہ حکام کو کھانے کا نمونہ، معائنے کے لیے ان کی قیام گاہ یا دفتر میں بھجوایا جاتا تھا۔ ظفر علی خاں لنگر خانے کی دن بھر کی کارکردگی کی ایک رپورٹ لکھ کر، روزانہ، حکام کو روانہ کرتے تھے------ یہ سارے اور دیگر متعلقہ امور، بڑی توجہ، محنت، تدبر اور چوکسی کے تھے۔ ظفر علی خاں خود بہت بیدار مغز، فعال اور جفاکش انسان تھے لیکن کسی ادارے کو چلانے میں نظم و تدبیر کا رخ صحیح نہ ہو اور حسب ضرورت و موقع، بعض اقدامات، بروقت نہ انجام دیے جائیں تو محض انفرادی محنت و مشقت سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ پھر کسی کام کو محنت کے ساتھ خود انجام دینا آسان ہے اور اس کے مقابلے میں دوسروں سے کام لینا مشکل ہے۔ خصوصاً مختلف المزاج اور گوناگوں طبائع رکھنے والے معاونین اور کارکنوں سے کام لینے کے لیے بڑی حکمت و تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظفر علی خاں سزاوار تحسین ہیں کہ وہ معاونین کی ایک بڑی تعداد کو ساتھ لے کر چلے اور لنگر خانے کی گوناگوں ذمہ داریوں سے نہایت خوبی و کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔

اس کار مہم کی انجام دہی میں منصبی فرض کے ساتھ، انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبات کا بھی دخل تھا۔ ظفر علی خاں کی سوانحی کتابوں میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو خاطر خواہ انداز سے اجاگر کرنا ضروری ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ظفر علی خاں کے یہ مختصر سوانحی کوائف حسب ذیل کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں:

الف: **ظفر علی خاں: ادیب و شاعر**، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۶۷ء۔

ب: مولانا ظفر علی خاں: احوال و آثار' ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی' مجلس ترقی ادب لاہور' ۱۹۸۶ء۔

ج: مولانا ظفر علی خاں: حیات' خدمات و آثار' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور' ۱۹۹۳ء۔

سوانح ظفر کے بعض اہم کوائف و واقعات کے ضمن میں ان کتابوں میں کئی جگہ اختلاف ملتا ہے۔ حیات ظفر کے بعض ابواب اب بھی نامکمل ہیں اور بعض معاملات تاحال تحقیق طلب ہیں۔

۲۔ مثلاً: ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کی متذکرہ بالا کتاب (حوالہ ا' کتاب: ب)۔

۳۔ مثلاً: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی متذکرہ بالا کتابیں (حوالہ ا)۔

۴۔ بعض کتابوں (خصوصاً اس موضوع پر سب سے مفصل تصنیف (حوالہ ا' کتاب: ج) میں رود موسیٰ کی طغیانی کا سنہ ۱۹۰۵ء بتایا گیا ہے۔ یہ اس لیے درست نہیں کہ: رپورٹ کارگزاری لنگرخانہ افضل گنج کے مطابق' امدادی لنگرخانے کا زمانہ ۲ تا ۱۶ رمضان ۱۳۲۶ھ ہے' جو ۲۸ ستمبر تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے مطابق بنتا ہے۔ نظم' اس کے بعد ہی لکھی گئی۔

۵۔ یہ شعر ظفر علی خاں کی نظم "شور محشر" کا ہے جو انھوں نے سیلاب کی تباہ کاریوں پر لکھی تھی۔ (مخزن' جنوری ۱۹۰۹ء)۔

۶۔ تذکرہ حیدر آباد از رمن راج سکسینہ' ترقی اردو بیورو' نئی دہلی' ۱۹۸۸ء' ص ۱۹۳ تا ۱۹۵۔

۷۔ مثلاً:

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا غرقاب محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں کبھی نہ ڈوبا امجد غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

بہ گیا تھا جو رود موسیٰ میں وہی خانہ خراب ہے امجد
(دیکھیے: حوالہ ۶' ص ۱۹۵)

۸۔ نظم "شور محشر" کے بارے میں ظفر علی خاں کے سوانح نگاروں کے ہاں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ میرے فاضل دوست پروفیسر جعفر بلوچ نے راقم کے استفسار کے جواب میں' حسب ذیل خط میں صورت حال واضح کی ہے۔ (ایک دو جگہ نام حذف کر دیے گئے ہیں) وہ لکھتے ہیں:

"کل آپ کے فون آنے کے بعد میں نے مولانا ظفر علی خاں کی نظم "شور محشر" کے سلسلے میں اپنے کاغذات دوبارہ دیکھے۔ معلوم یہ ہوا کہ موسیٰ ندی کے بارے میں مولانا نے دو نظمیں کہی تھیں۔ ایک وہ جو جنوری ۱۹۰۵ کے دکن ریویو میں شائع ہوئی اور دوسری وہ جو غالباً دسمبر ۱۹۰۸ء کے دکن ریویو میں بھی شائع ہوئی اور الگ کتابچے کی صورت میں بھی۔ ۱۹۰۵ء کی نظم "رود موسیٰ" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم فطرت نگاری کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ مولانا حالی نے بھی اپنے خط میں، جو پہلے دکن ریویو ہی میں شائع ہوا تھا اور بعدازاں مکاتیبِ حالی میں مرتب ہوا، مولانا ظفر علی خاں کی اس نظم کی توصیف منظر نگاری ہی کے حوالے سے کی ہے۔ اس نظم میں اس تباہ کن طغیانی کا کوئی تذکرہ نہیں جس کی طرف ہمارے مخدوم پروفیسر------ نے اپنی کتاب ------ میں تفصیلی اشارات کیے ہیں۔ ۱۹۰۵ء والی نظم کا عنوان ڈاکٹر ----- نے "شور محشر" تحریر کیا ہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔ دراصل "شور محشر" وہ نظم ہے جو موسیٰ ندی کے ۱۹۰۸ء والے قیامت خیز سیلاب کے بارے میں کہی گئی تھی اور اس کے متعدد بند تھے۔ نظم "شور محشر" مولانا ظفر علی خاں نے اسی بحر میں کہی تھی جس میں وہ پہلے ۱۹۰۵ء میں نظم "رودِ موسیٰ" کہہ چکے تھے بلکہ "رودِ موسیٰ" کو جو بتیس (۳۲) اشعار پر مشتمل تھی، معمولی ترمیم و تصرف کے بعد اس نئی نظم "شور محشر" کا دوسرا بند بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظم "رود موسیٰ" (مطبوعہ ۱۹۰۵ء) ڈاکٹر ------- صاحب کی نظر سے گزری ہی نہیں اور انھوں نے محض قیاس یا مفروضے کی بنا پر نظم "شور محشر" کو ۱۹۰۵ء والی نظم قرار دے دیا۔ اس طرح سیاق واقعات میں خلل واقع ہوا اور کئی غلط فہمیوں کے دروازے کھل گئے۔

"نظم "شورِ محشر" کے پہلے چھے بند ماہنامہ مخزن لاہور کے شمارہ بابت جنوری ۱۹۰۹ء میں بھی شائع ہوئے تھے اور اب اس نظم کا یہی حصہ محفوظ ہے۔ دکن ریویو کا دسمبر ۱۹۰۸ء کا شمارہ یا وہ کتابچہ مل جائے جس میں یہ نظم الگ سے شائع ہوئی تھی، تو اس نظم کا متن مکمل کیا جا سکتا ہے"۔

راقم اس وضاحت کے لیے پروفیسر جعفر بلوچ کا شکر گزار ہے۔

۹۔ مخزن لاہور، جنوری ۱۹۰۹ء، ج ۱۶، ش ۴، ص ۶۹۔

۱۰۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے، افضل گنج کے امدادی مرکز کے انچارج کے طور پر، ظفر علی خاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "انھوں نے نہایت ہمدردی اور جاں سوزی سے مسلسل اٹھارہ دن تک شب و روز یہ خدمت سرانجام دی"۔ (کتاب مذکور نمبر ۲، حوالہ ۱)

لنگرخانے کی صحیح مدت کار پندرہ دن ہے۔ اس کی تصدیق زیر بحث رپورٹ کارگزاری سے ہوتی ہے۔

۱۱۔ "کتاب الآرا" Vistors' Book کا عمدہ ترجمہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کو تراکیب و اصطلاحات کے ترجمے میں جو مہارتِ تامہ حاصل تھی، یہ بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔

۱۲۔ سولہ اشعار کی یہ نظم **پیسہ اخبار** لاہور میں ۱۴ اگست ۱۹۰۹ء کے شمارے میں چھپی (دیکھیے: **مولانا ظفر علی خاں کی آپ بیتی**، مرتبہ: رابعہ طارق، ندوۃ المعارف لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۰ تا ۲۲۲) جناب حسن الدین احمد نے اپنی کتاب **محفل** (حیدر آباد دکن، ۱۹۸۲ء) میں **پیسہ اخبار** ۹ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے حوالے سے اس نظم کا جو متن دیا ہے، وہ ۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ابتدائی سولہ اشعار پر سترہ شعروں کا اضافہ کیا گیا ہے، گویا ظفر علی خاں نے بعد میں نظم میں اضافہ کر کے، اسے دوبارہ پیسہ اخبار میں شائع کروایا۔ ابتدائی سولہ شعروں کی پہلی اور بعد کی مذکورہ بالا اشاعتوں میں ایک دو جگہ لفظی اختلاف ہے۔ نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

نہ بنگالی سے گھبرا، اور نہ مدراسی کی پروا کر
مگر مسجد میں جھٹ گرپڑ، اگر آئے نظر واکر
دبک جاتے ہیں مسٹر حیدری مانند گیدڑ کے
گرجتا اور بپھرتا جب ہے مثل شیر نر، واکر
پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت
اک انگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتروا کر
نظام الملک آصف جاہ، اگر لیں کام قوت سے
تو آئے دوسرے دن سے ہی لندن میں نظر واکر

یہ نظم بھی حیدر آباد سے ظفر علی خاں کے خارج البلد قرار دیے جانے کا ایک سبب بنی۔ تفصیل دیکھیے: **مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار**، ص ۴۳، ۴۷۔

۱۳۔ یہاں متن میں "سخت" ہے، جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

اُردو میں ادبی تحقیق

ایک اجمالی جائزہ

جملہ اصناف ادب میں، تحقیق وہ بھاری پتھر ہے جسے اردو کے بیش تر نقادوں نے چوم کر چھوڑ دینے ہی میں عافیت سمجھی ہے۔ تحقیق، پتا ماری اور جگر کاوی کا دوسرا نام ہے اور ایک محقق کو، ہر آن، پل صراط سے گزرنے والے کی طرح محتاط رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں اول درجے کے بیسیوں نقادوں کے مقابلے میں پائے کے محققوں کے نام بہ آسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ا

ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ رائے کہ: ”اردو میں تحقیق کا آغاز--- دور سرسید سے ہوتا ہے“[۱] اس اعتبار سے بہت صائب ہے کہ خود سرسید احمد خاں کی بعض کاوشوں (آثار الصنادید، آئینِ اکبری اور تصحیح تاریخِ فیروز شاہی) اور ان کے رفقا کی بعض تصانیف میں ایک پختہ تحقیقی شعور موجود ہے، مثلاً: شبلی کی الفاروق، سیرۃُ النبیؐ اور تدوین: تذکرہ گلشن ہند یا محمد حسین آزاد کی سخن دان فارس یا حالی کی سوانحی تصانیف۔ مابعد جو بزرگ تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے (مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی، پروفیسر شیخ محمد اقبال، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ) انھوں نے:

”صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا۔ اردو، فارسی اور عربی کے سرمائے کو بند الماریوں سے نکالا، متون کی ترتیب و تصحیح کی، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا، زبان کے آغاز و ارتقا

کی نشان دہی کی، ادبا و شعرا کے حالات و واقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا، جس سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا"۔ [۲]

دکنی زبان و ادب پر تحقیق کا ابتدائی کام محی الدین قادری زور، سید محمد، عبدالقادر سروری، مولوی عبدالحق اور نصیرالدین ہاشمی کا ہے۔ یہ اصحاب مغرب میں تحقیق کے طریقۂ کار سے ایک حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے ہاں تکمیل اور گہرائی کا رویہ بالعموم نظر نہیں پایا جاتا، بہ ایں ہمہ ان کی تحقیقات قابل قدر ہیں۔

صحیح معنوں میں ادبی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۶ء) سے ہوتا ہے۔ تحقیق سے انھیں طبعی مناسبت تھی۔ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب کو مغربی طرز تحقیق سے بھی شناسائی تھی۔ انھیں کئی برس لندن میں رہنے کا موقع ملا، جس نے ان کے علمی تجربے میں اضافہ اور تحقیقی مزاج میں استحکام پیدا کیا۔ شیرانی صاحب لغت، لسانیات اور عروض کے ماہر تھے، اور مسکوکات سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے سکوں، کتبوں، مہروں، تصویروں اور علم خط سے اپنی تحقیق اور استخراج نتائج میں مدد لی۔ ان کی دشوار پسند طبیعت کو یکسوئی کے ساتھ تحقیق و تصنیف کا موقع ملا۔ اُن کی گرفت سے کوئی نہ بچ سکا۔ شعرُالعجم اور آبِ حیات پر اُن کی تنقید بے رحمانہ ہے یا "ظالمانہ" [۳] مگر اس میں شبہ نہیں کہ شیرانی صاحب کی بت شکنی نے مقام تحقیق سے آسان گزرنے والوں کے اندر محنت اور ذمہ داری سے کام لینے کا احساس پیدا کیا۔ مجموعۂ نغز کی تدوین، مثبت تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں "اردو تدوین و تحقیق کے معلم اول" ہیں۔ تحقیق و تدوین دونوں شعبوں پر، ان کا بیش تر کام بہ قول رشید حسن خاں: "مثال و معیار کی حیثیت رکھتا ہے"۔ [۴]

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) کو شیرانی صاحب کی سی یکسوئی حاصل نہیں تھی۔ "یک سرو ہزار سودا" کے مصداق، ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا دائرہ وسیع اور متنوع تھا۔ انھوں نے نہایت جاں فشانی اور محنت سے قدیم متون دریافت کر کے ان کی تدوین کی، ان پر تحقیقی مضامین لکھے، اور تنقید بھی کی۔ یوں تو اُن کے سبھی کام بیش قیمت ہیں، مگر گیان چند کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا

حصہ علم کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بہترین مثال ہے۔[۵] ترویج اُردو کے لیے اُن کی چومکھی لڑائی اس پر مستزاد! بہ حیثیت مجموعی اُردو کے لیے ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں، مگر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اُن کی سی ہنگامہ خیز زندگی، تحقیق کو راس نہیں آتی۔

مولوی محمد شفیع مرحوم (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۶۳ء) بنیادی طور پر عربی اور فارسی کے محقق تھے مگر محمد حسین آزاد، ذوق اور داغ پر بھی ان کے مقالات: "تحقیق کا اعلیٰ نمونہ"[۶] ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق میں ریاضت کے ساتھ وسعت اور گہرائی میں جانے کا ذوق پیدا کیا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے شاگردوں کی تربیت کی اور انھیں تحقیق کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔ مولوی صاحب کی طرح ان کے شاگرد ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۰۴ء۔ ۱۹۸۶ء) بھی عربی، فارسی اور مشرقی علوم کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ سید صاحب ابتدائی دور میں فارسی ادب کی تحقیق میں مصروف رہے۔ بعدہ، انھوں نے اردو میں شہر آشوب، تذکروں اور زبان و لغت کے بعض مسائل پر نہایت وقیع تحقیقی مقالات لکھے۔ تحقیق میں اُن کا اسلوب بھی اُن کی شخصیت کی طرح مرنجاں مرنج اور توازن و اعتدال پر مبنی ہے۔ آخری زمانے میں اُن کا جھکاو تحقیق سے زیادہ تنقید کی طرف ہو گیا تھا اور علمی و ادبی تحقیق، ان کے علم و فضل اور تحقیقی نظر سے محروم ہو گئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آخری بیس برسوں میں ان کا بیش تر وقت اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تیاری و تکمیل میں صرف ہوا جو سید مرحوم کا ایک کارنامہ ہے۔ نفاذ اردو تحریک بھی ان سے وقت کا خراج لیتی رہی۔

قاضی عبدالودود (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۸۴ء) اردو تحقیق میں ایک بڑا نام ہے۔ قدیم مشرقی علوم اور عربی و فارسی میں مہارت کے ساتھ ساتھ، قاضی صاحب انگریزی، یونانی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ ان کی سخت گیری اور صاف گوئی و بے باکی، دراصل محمود شیرانی کی اخلاقیات تحقیق کی توسیع ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے ان کے "درشت لہجے" کا ذکر کیا ہے[۷] مگر اُن کا انتہائی معروضی اور کھرا انداز اور مختصر نویسی اردو تحقیق کے حق میں ایک نیک فال ہے۔ ان کی بیش تر تحریروں کو معترضانہ اور احتسابی تحقیق کا نام دیا گیا

ہے۔ قاضی صاحب کے اعتراض و احتساب اور ان کی ''چیرہ دستیوں'' نے اردو تحقیق کو کج روی سے باز رہنے اور گم راہی سے بچنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ ہم انھیں بجا طور پر ''تنبیہہُ الغافلین تحقیق'' اور ''معلم المحقّقین '' کہہ سکتے ہیں۔[۸] تحقیق میں کوئی شخص کامل و اکمل نہیں ہو سکتا۔ قاضی صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں بھی کمزور اور ناکافی حوالوں' داخلی تضاد اور سہل انگاری کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ مخففات کو چیستان بنا دیتے ہیں۔ کبھی ان کے ہاں طنزیہ رنگ آ جاتا ہے' جو غیر علمی اور غیر تحقیقی انداز ہے۔ اسی طرح کہیں کہیں اُن کا اسلوب خشکی و بے کیفی اور ضرورت سے زیادہ اختصار و اجمال کا شکار ہو گیا ہے۔[۹]

تحقیق میں قاضی عبدالودود کی تمام تر مثالیت پسندی کے باوجود' یہ سوال بڑا اہم ہے کہ: ''تحقیق میں ان کا کارنامہ کیا ہے؟'' اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''مالک رام نے ذکر غالب اور گل رعنا کے علاوہ ابو الکلام آزاد کی کتابوں کی خوب سے خوب تر ترتیب دی لیکن قاضی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی بڑا کام نہ کیا۔ کاش وہ مصحفی یا انشا پر کوئی یادگار کتاب لکھ جاتے۔ کاش وہ تمام تذکروں کو سمو کر ادیبوں کی سوانحی ڈکشنری (۱۸۵۷ء تک) تیار کر دیتے۔ کیسی خاصے کی چیز ہوتی۔ یہ مسلم کہ ان کی تنبیہوں کی بڑی قیمت ہے' اس سے راہ تحقیق کی استقامت میں بہت مدد ملی لیکن تنقید شعر العجم کا مرتبہ شعر العجم کے برابر نہیں ہوتا۔ انھوں نے کتنے زیادہ علم سے کتنا چھوٹا کام لیا''۔[۱۰]

قاضی صاحب کے بارے میں جناب مشفق خواجہ کی رائے بھی قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب بہ یک وقت بہت بڑے اور بہت چھوٹے آدمی تھے۔ انھیں دوسروں کی چھوٹی غلطیاں نظر آ جاتی تھیں لیکن اپنی بڑی غلطیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ علمی کاموں میں بھی ذاتی رنجشوں کا انتقام لیتے تھے اور اگر کسی سے گہرے تعلقات ہوتے تو اس کی فاحش غلطیوں کو بھی نظرانداز کر دیتے تھے''۔[۱۱]

مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ء-۱۹۷۵ء) کی بیش تر تحقیق قدیم اسٹیج' ڈرامے اور میر انیس سے متعلق ہے۔ ادبی تحقیق میں وہ احتسابی رویے کے برعکس تعمیری تحقیق کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تحقیق کا سب سے بڑا اصول سچائی کی تلاش ہے۔ مسعود

حسن رضوی نے اپنی کاوشوں کو کبھی بھی حرفِ آخر نہیں سمجھا' وہ ہمیشہ خوب تر کی جستجو اور اپنی ہی کاوشوں کو مزید جامع بنانے کی فکر میں رہے۔ لکھنئو کا عوامی اسٹیج' لکھنئو کا شاہی اسٹیج' انیسیات اور ان کے مرتبہ متعدد تذکرے ان کی تحقیقی یادگاروں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ میرانیس اور اردو ڈرامے کی خوش بختی ہے کہ انھیں مسعود صاحب جیسا محقق نصیب ہوا مگر: "محمد حسین آزاد اور واجد علی شاہ کا ذکر آتے ہی' معلوم نہیں کیوں' وہ بہت جذباتی ہو جایا کرتے تھے--- ان دونوں موضوعات کے سلسلے میں اگر مرحوم کی تحریروں سے استفادہ کیا جائے تو اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رہنا چاہیے"۔ [۱۲]

تحقیق میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۰۴ء- ۱۹۸۱ء) کا مقام و مرتبہ مسلم ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ عربی زبان و ادب کی طرف رہی۔ ان کا سا وسیع مطالعہ' قدیم و جدید علوم اور متعدد زبانوں سے واقفیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ اُردو میں اُن کی تحقیقی کاوش غالبیات پر مرکوز رہی۔ نوابان رام پور کے نام مکاتیب غالب کے ذریعے انھوں نے عملاً واضح کیا کہ مثالی تدوین متن کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ [۱۳] مزید برآں ان کا مرتبہ دیوان غالب اور تذکرہ دستور الفصاحت تحقیق و تدوین کے معیاری اور بیش بہا نمونے ہیں۔ گیان چند نے عرشی صاحب کو بجا طور پر اردو تحقیق کے عناصر خمسہ میں شمار کیا ہے۔ (باقی چار: محمود شیرانی' مسعود حسن رضوی' قاضی عبدالودود' مالک رام)۔ [۱۴]

رسالہ "آج کل" دہلی (اگست ۱۹۶۷ء) کے اردو تحقیق نمبر کے سرورق پر اردو کے چار زندہ محققین کی تصاویر ہیں: قاضی عبدالودود' امتیاز علی عرشی' مسعود حسن رضوی اور مالک رام۔ نیچے لکھا ہے: "اردو تحقیق کے چار ستون"۔ مالک رام کی تحقیق کی فروگذاشتوں پر' اسی رسالے میں گرفت بھی کی گئی ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ مالک رام (۱۹۱۲ء- ۱۹۹۳ء) نے غالبیات کے متنوع پہلوؤں پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ ذکر غالب کے بغیر' غالبیات کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ غبار خاطر' خطبات آزاد اور مختار الدین احمد کے اشتراک سے گلشن ہند کی تدوین بھی ان کے عمدہ کام ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی (۱۸۹۵ء-۱۹۶۹ء) کی کتاب تحقیق کی روشنی میں ان کی

عمیق تحقیقی نظر کا پتا دیتی ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۶ء) نامور نقاد تھے لیکن ان کی مایۂ ناز تصانیف ہماری داستانیں اور داستان سے افسانے تک میں تنقید کے ساتھ تحقیق کے نقوش بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۸ء) بھی بنیادی طور پر نقاد تھے، مگر انھوں نے اپنے قیام لندن کے زمانے میں برٹش میوزیم سے اردو کے کلاسیکی ادب کے بہت سے متون حاصل کر کے انھیں شائع کر دیا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (پ: ۱۹۱۲ء) "علم و فضل کے اعتبار سے بحر زخّار ہیں"۔[۱۵] اگرچہ ان کی تحقیقات کا بڑا حصہ فارسی زبان و ادب سے متعلق ہے، تاہم علمی نقوش، حالی کا ذہنی ارتقا، اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات اور اقبال اور قرآن اردو میں ادبی تحقیق کا اہم سرمایہ ہیں۔[۱۶]

ڈاکٹر وحید قریشی (پ: ۱۹۲۵ء) کا تعلق، حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع کے دبستان تحقیق سے ہے۔ انھوں نے دونوں بزرگوں سے معنوی فیض اٹھایا اور مؤخر الذکر سے براہ راست استفادہ بھی کیا۔ انھوں نے اپنے مجموعہ مقالات کلاسیکی ادب کا مطالعہ کے آغاز میں مولانا شبلی کا یہ اقتباس درج کیا ہے:

"آج اجتہاد، اور تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے۔ آج ہم کو کسی مسئلے کو اس بنا پر ماننا یا انکار نہیں کرنا چاہیے کہ کسی بڑے سے بڑے شخص کی رائے اس کے متعلق کیا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ فی نفسہ وہ مسئلہ کیا ہے؟ ہم وہ لوگ ہیں کہ پیغمبر کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے"۔[۱۷]

اس سے تحقیق میں ڈاکٹر وحید قریشی کا زاویۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ تاریخ سے خصوصی شغف کے سبب انھوں نے اپنی فارسی اور اردو تحقیقات میں تاریخ کو آمیز کیا اور استخراج نتائج میں بھی تاریخ کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی۔[۱۸] محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کی روایت میں ان کے بعض مقالات، احتسابی تحقیق کی ذیل میں آتے ہیں مگر زیادہ تر تحریریں، بعض نئے موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان کی مرتبہ مثنویات میر حسن اور دیوان جہاں دار تدوین کے ضمن میں عمدہ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اُن کی تحقیقی کاوشوں کا دائرہ نسبتاً وسیع ہے، جنھیں سمجھنے کے لیے میر حسن اور ان کا زمانہ اور مقالات تحقیق دیکھنا

ضروری ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (پ: ۱۹۲۹ء) کے ہاں تنقید اور تحقیق کا امتزاج ملتا ہے۔ مثنوی کدم راو پدم راو کی تدوین بلاشبہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی کی تدوین بھی کی۔ تاریخ ادب اردو جالبی صاحب کا بڑا اہم تحقیقی و تنقیدی کام ہے۔ خدا انھیں اس کی تکمیل کی توفیق دے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (پ: ۱۹۲۶ء) کے تحقیقی کاموں میں اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ' اردو میں منظوم داستانیں' ہندی اردو تنازع اور فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت نمایاں ہیں۔ ان کا بہت سا وقت نگار و نیاز کی نذر ہوا۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد (پ : ۱۹۲۴ء) عمر بھر عربی زبان و ادب کی تدریس سے متعلق رہے' مگر انھوں نے اردو متون کی دریافت و تدوین کے ضمن میں بعض یادگار کام انجام دیے۔ گلشن ہند (حیدر بخش حیدری) کی دریافت و تدوین' اسی طرح تذکرہ آزردہ ' پھر مالک رام کی معاونت سے کربل کتھا کی تدوین' جو "تحقیق و تدوین دونوں کا شاہکار" ہے۔[19] ڈاکٹر مسعود حسین خاں (پ: ۱۹۱۹ء) نے لسانی اور ادبی تحقیق کے ذیل میں ایک داستان بکٹ کہانی (بہ اشتراک نور الحسن ہاشمی) مدون کی اور چار مثنویاں: پرت نامہ' قصہ مہر افروز و دلبر' ابراہیم نامہ اور عاشور نامہ بھی۔ گیان چند کی نظر میں یہ "تدوین کے ہر اصول کے مطابق اعلیٰ درجے کے کام ہیں"۔[20]

خود گیان چند (پ : ۱۹۲۳ء) کا تحقیقی کام بہت وقیع اور متنوع ہے۔ ان کی تحقیقی کاوشیں نظری و عملی اور اختصاصی شعبوں پر محیط ہیں۔ تحقیق کا فن ' مصنف کی علمی و تحقیقی اور تدریسی زندگی کے تجربات کا ماحصل ہے۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں اور اردو مثنوی شمالی ہند میں کے علاوہ ذکر و فکر' کھوج اور پرکھ اور پہچان سے بھی ان کے تحقیقی مزاج و منہاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اعتدال و انکسار کا رویہ نمایاں ہے۔ اظہار حقیقت میں وہ صاف گوئی اور بے باکی سے کام لیتے ہیں اور اصولوں پر سمجھوتے کے قائل نہیں۔ جس کا جتنا اور جیسا کام ہو' اس کا اعتراف ضروری سمجھتے ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ گیان چند نے اپنی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو بھی کھلے دل سے

تسلیم کیا ہے۔ تحقیق میں ان جیسا دل چسپ شگفتہ اسلوب بہت کم محققین کے ہاں ملتا ہے۔

رشید حسن خاں (پ: ۱۹۲۵ء) کا کام نظری و عملی تحقیق میں تطابق کی ایک عمدہ مثال ہے۔ لغت اور زبان و قواعد کے ساتھ انھوں نے املا کے مسئلے پر پہلی بار اتنی شرح و بسط اور دِقّتِ نظر کے ساتھ قلم اٹھایا ہے کہ اب اسے ایک سنجیدہ اور زندہ موضوع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور ان کے اصول املا کی تقلید کی جانے لگی ہے۔ ادبی تحقیق' مسائل اور تجزیہ میں انھوں نے تحقیق کے اصولوں اور اخلاقیات کی نشان دہی کے ساتھ' زمانۂ حال کی بعض تصانیف کے تجزیے میں ان کا اطلاق بھی کیا ہے' جو عملی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تدوین کے ضمن میں انھوں نے سوداؔ اور ناسخؔ کا منتخب کلام مرتب و مدون کیا۔ انھوں نے بعض متون فسانۂ عجائب' باغ و بہار' گلزارِ نسیم اور مثنویاتِ شوق کی نہایت خوبی و عمدگی اور معیار کے ساتھ تدوین کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا کہا ہے کہ رشید حسن خاں کی مرتبہ یہ کتابیں بہ اعتبار تدوین و تحقیق: "آنے والی نسلوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں"۔ [۲۱] تحقیقی تدوین کے کام آیندہ بھی ہوں گے' مگر اس معیار کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ممکن ہے کہ خاں صاحب ہی' اردو تحقیق کے اس شعبے میں "خاتم المُدوِّنین" ثابت ہوں۔ حق گوئی و بے باکی اور احتساب میں' وہ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کی روایت کے امین ہیں۔ ان کی شہرت احتسابی محقق کی ہے' مگر انھوں نے احتساب کے ساتھ ساتھ مثبت طور پر مثالی تحقیق کے معیاری نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ وصف امتیازی' اردو کے احتسابی محققین کو کم ہی نصیب ہوا ہے' قاضی عبدالودود کو بھی نہیں۔ رشید حسن خاں کے تنقیدی مجموعے تلاش و تعبیر اور تفہیم بھی لائق مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (پ: ۱۹۲۴ء) سید عبداللہ کے شاگرد خاص اور انھی کی تحقیقی روایت کے امین ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوشوں کا دائرہ وسیع ہے۔ ڈاکٹریٹ کا مقالہ: اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر' دیوان زادہ کی تدوین' ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی خاطرات کی تدوین' مولانا ظفر علی خاں: حیات' خدمات و آثار وغیرہ

ان کے اہم کام ہیں۔ ان کی تحقیق، تاریخ سے ان کی گہری دل چسپی کی غماز ہے۔

جناب مشفق خواجہ (پ: ۱۹۳۵ء) نے تحقیق و تدوین میں قدر اول کی چیزیں پیش کی ہیں۔ **تذکرہ خوش معرکہ زیبا اور اقبال** تحقیقی تدوین کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ **جائزہ مخطوطات اردو** اونچے معیار کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ فہرست سازی کا ایسا نادر نمونہ ہے، جو کسی بڑے ادارے کا کام تھا، مگر اسے مشفق خواجہ نے تن تنہا انجام دیا ہے۔ ان کی تحقیقی کاوش **غالب اور صفیر بلگرامی** اور مقالات کا مجموعہ **تحقیق نامہ** دقت نظر اور تحقیق کی افقی و عمودی جہات کے معیاری نمونے ہیں۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر تحقیق کی ہے جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پر کرتے ہیں اور جن پر ابھی تک کام نہیں ہوا۔[۲۲] محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی احتسابی روش کے برعکس مشفق خواجہ نے مثبت طور پر تعمیری تحقیق کا راستہ اختیار کیا ہے۔ خواجہ صاحب کا بہت سا تحقیقی کام ہنوز تشنہ طباعت ہے۔

آج سے ۳۶ سال پہلے گیان چند نے مالک رام کے بارے میں لکھا تھا:

"مالک رام نے غالب کی نظم و نثر، اردو و فارسی، سوانح اور شخصیت سب پر تحریروں کا انبار لگا دیا ہے۔ کسی دوسرے ماہر غالبیات نے غالب پر اتنا زیادہ اور اتنے متنوع پہلوؤں پر نہیں لکھا"[۲۳]

آج گیان چند کو اپنی رائے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہو گی کیوں کہ گذشتہ ربع صدی میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (پ: ۱۹۴۲ء) نے غالبیات پر مضامین نو کے انبار لگا دیے ہیں۔ **غالب اور انقلاب ستاون**، **تحقیق غالب**، **غالب کا علمی سرمایہ** اور **تدوین دیوان غالب**، **نسخہ خواجہ** جیسی کتابوں پر انھوں نے غلام رسول مہر سے لے کر مشفق خواجہ تک سے داد پائی ہے۔

اردو کی ادبی تحقیق کا معتدبہ حصہ، جامعات سے وابستہ اساتذہ کی کاوشوں کا مرہون منت ہے، چنانچہ بھارت اور پاکستان کی جامعات سے وابستہ متعدد اساتذہ نے تحقیق و تدوین کے قابل قدر کام انجام دیے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس اجمالی جائزے میں ان سب کا ذکر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ بعض محقق اساتذہ کے نام یہ ہیں: تنویر احمد علوی، ابواللیث

صدیقی، نثار احمد فاروقی، نجم الاسلام، محمد انصار اللہ، عابد پیشاوری (م: ۱۹۹۹ء)، حنیف احمد نقوی، خواجہ محمد زکریا، معین الدین عقیل، کاظم علی خاں، تحسین فراقی، صابر کلوروی۔

بعض اصحاب نے آزادانہ طور پر تحقیق و تدوین کو مشغلہ حیات کے طور پر اپنایا، جیسے: کلب علی خاں فائق (م: ۱۹۸۰ء)، شوکت سبزواری (م: ۱۹۷۳ء)، افسر امروہوی (م: ۱۹۸۴ء) خلیل الرحمٰن داوٗدی، خلیق انجم، انور سدید، کالی داس گپتا رضا، قدرت نقوی، محمد اکرام چغتائی، گوہر نوشاہی، عطش درانی وغیرہ۔

۲

تحقیق کے مختلف شعبوں کو لیجیے تو تحقیق کے اصول و مبادی، طریق کار اور نظری پہلوؤں پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مثلاً: **مبادیات تحقیق** از عبدالرزاق قریشی، **متنی تنقید** از خلیق انجم، **اصول تحقیق و ترتیب متن** از تنویر احمد علوی، **ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ** از رشید حسن خاں، **تدوین متن کے مسائل** مرتبہ: عابد رضا بیدار، **ادبی اور لسانی تحقیق**، مرتبہ: عبدالستار دلوی، **ادبی تحقیق کے اصول** از تبسم کاشمیری، **تحقیق کا فن** از گیان چند، رسالہ آج کل دہلی کا اردو تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) رسالہ **تحقیق** حیدر آباد سندھ کے متعدد شمارے۔ اصول تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، سید عبداللہ، جمیل جالبی اور مظفر علی سید وغیرہ کے مضامین بھی معلومات افزا اور مفید ہیں۔

۳

اردو کے تحقیقی سرمایے کا معتدبہ حصہ اُن امتحانی تحقیقی مقالات پر محیط ہے جو بر عظیم کی مختلف جامعات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے اور پیش کیے گئے مگر یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ان میں سے بیش تر غیر معیاری ہیں۔ چونکہ مقصود محض ڈگری کا حصول تھا، اس لیے ایسے مقالات میں تحقیق کے اصولوں اور اخلاقیات کو بری طرح پامال کیا گیا ہے۔ اتفاق سے اس وقت میرے سامنے شمیم انہونوی کا مرتبہ تذکرہ

خوش معرکہ زیبا ہے جس پر مقالہ نگار کو لکھنؤ یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ سعادت خاں ناصر کے اس تذکرے کے چار قلمی نسخے دستیاب ہیں جو لکھنؤ یونی ورسٹی، پٹنہ، علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ متذکرہ بالا تدوین، چار نسخوں کے باہمی موازنے کے بجاے صرف دو نسخوں کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ مرتب نے مخطوطۂ لکھنؤ کو اپنی تدوین کی بنیاد بنایا، اور نسخہ پٹنہ کے اختلافات میں حاشیے میں درج کر دیے۔ لیجیے، تذکرہ مدون ہو گیا اور یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بخش دی۔ رہے باقی دو نسخے، تو علی گڑھ کے مخطوطے میں بہ قول مرتب: "شعرا کی ترتیب، پٹنہ کے نسخے کے مطابق ہے، لیکن نہ تو اس میں حواشی ہیں، اور نہ ہی متن میں اُن شعرا کا ذکر ملتا ہے، جو نسخہ پٹنہ کے حواشی پر درج ہیں، اس لیے اس سے مقابلہ کرنا ضروری خیال نہیں کیا گیا"۔ (ص ۸)--- اور جہاں تک چوتھے نسخے (انجمن) کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مقالہ نگار کہتے ہیں کہ اس تک: "راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی، سنا ہے وہ پٹنے والے نسخے کی نقل ہے"۔ اب جہاں: "سنا ہے کہ---" کی بنیاد پر کاروبار تحقیق چلایا جائے، وہاں نتیجہ معلوم! چار نسخوں میں سے دو کو دیکھے بغیر ہی چھوڑ دینا، سہل انگاری کی نہایت افسوس ناک مثال ہے۔

یہ سہل انگاری اور تن آسانی، بھارت کی جامعات کے ساتھ مخصوص نہیں، پاکستان میں بھی اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، تاہم بھارت میں تحقیق کا معیار اس لیے بہ طور خاص غور طلب ہے کہ اخلاقیات تحقیق کی بحثیں زیادہ تر وہیں سے اٹھائی گئیں اور تحقیق کے اصول و ضوابط پر بیش تر کتابیں بھی وہیں کے اکابر محققین نے لکھی ہیں۔ مزید یہ کہ بعض اوقات ایک ہی موضوع پر بھارت میں ہونے والی سندی تحقیق، بہ اعتبار معیار، اسی موضوع پر کسی پاکستانی محقق کی کاوش سے فروتر ہے۔ اس سلسلے میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً: پاکستان میں جناب مشفق خواجہ کا مرتبہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا شمیم انہونوی کے مذکورہ بالا تذکرے سے کہیں زیادہ بلند پایہ اور معیاری ہے۔ اکبر الٰہ آبادی پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مقالہ اکبر الہ آبادی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اسی موضوع پر بھارت میں لکھے جانے والے سندی مقالوں (از ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور ڈاکٹر

افصح ظفر) سے زیادہ جامع' مستند اور معیاری ہے۔ پاکستان میں بہتر تحقیق کی چند مثالوں سے قطع نظر' بھارت میں بھی اچھے اور معیاری تحقیقی کام بھی ہوئے ہیں' مثلاً: رجب علی بیگ سرور از نیر مسعود' ذوق' سوانح اور انتقاد از تنویر احمد علوی' ناسخ از شبیہ الحسن نونہروی' انشاء اللہ خاں انشا از عابد پیشاوری' اور سید شاہ امین الدین علی اعلی: حیات اور کارنامے از حسینی شاہد وغیرہ۔[۲۴]

ڈاکٹر وحید قریشی کا خیال ہے کہ:

"پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار ست رہی ہے۔ بھارت میں اردو دشمنی کی قوی لہر اور حکومت کی معاندانہ روش کے باوجود اردو تحقیق میں جس معیار کا کام ہوا ہے' ہمارے علمی سرمایے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سبب شاید یہ ہے کہ وہاں اردو ادب اور زبان کی خدمت کا جذبہ ایک سرفروشانہ اور مجاہدانہ انہماک کا نتیجہ ہے۔ وہاں اردو کے محققین و ادبا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اردو زبان کے بقا و تحفظ کا مسئلہ خود ان کی مرگ و حیات کا مسئلہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہاں علمی سرگرمی کی رو زیادہ مؤثر اور متحرک ہے"۔[۲۵]

یہ رائے ۱۹۶۸ء کے آس پاس ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸' ۱۹ برس بعد' ڈاکٹر معین الدین عقیل نے پاکستان میں اردو تحقیق کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

"پاکستان میں اردو تحقیق کا معیار اور اس کی رفتار بھارت سے کسی طرح کم تر نہیں ہے' بلکہ بعض شعبوں میں زیادہ بہتر اور وقیع کام کیے گئے ہیں' مثلاً تصحیح متون کا کام یہاں زیادہ بہتر ہوا ہے"۔[۲۶]

بھارتی جامعات کے سندی مقالوں کا ایک تجزیہ معیار و تحقیق شمارہ ۲' (پٹنہ' ۱۹۹۱ء) کے ذریعے سامنے آیا ہے' یہ بھارت میں معاصر اردو تحقیق کا قابل رشک معیار پیش نہیں کرتا (تفصیل کے لیے دیکھیے: اسی مجموعے میں شامل مضمون: بھارت میں ادبی اور لسانی تحقیق)۔ اگر پاکستان کے سندی مقالوں کا بھی ایسا ہی جائزہ لیا جائے تو ان کے معیار تحقیق کا اندازہ ہو سکے گا۔

اصل بات تو یہ ہے کہ بھارت ہو یا پاکستان' اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام انفرادی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اداروں کے زیر اہتمام مرتب ہونے والے منصوبے یا تو: "حسرت

ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے" کا مصداق بنتے ہیں یا اجتماعی کاوشوں سے پروان چڑھنے والے منصوبے ایسے انجام سے دوچار ہوتے ہیں جس کی ایک مثال علی گڑھ تاریخ ادب اردو ہے۔[۲۷]

اردو ادب کی ایک تاریخ پنجاب یونی ورسٹی کے منصوبے تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند کے تحت بھی تیار کرائی گئی۔ پانچ جلدوں پر مشتمل مذکورہ تاریخ کی واحد خوبی یہ ہے کہ یہ اردو ادب کی سب سے مفصل تاریخ ہے۔ اس میں مختلف الخیال مصنفین کی مختلف المعیار تحریریں شامل ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس کا تحقیقی پایہ معتبر اور تسلی بخش نہیں ہے۔[۲۸]

۴

اردو تحقیق کو کئی طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ سب سے زیادہ ضرورت قدیم متون کی تدوین اور ان پر تحقیق کی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے بعض نقادوں اور جدید لکھنے والوں کا رویہ نامناسب ہے۔ قدیم متون پر دیدہ ریزی کرنا ان کے نزدیک کارِ عبث ہے اور کرم خوردہ مخطوطات دریا برد کر دینے کے لائق ہیں، مگر یہ نادانی کی بات ہے۔ لغت، قواعد زبان اور لسانیات کی بنیاد، انھی متون کی تصحیح اور تحقیقی تدوین ہی پر استوار ہو سکتی ہے۔ تحقیق متون کے نتیجے میں بعض اوقات تاریخ ادب کے مسلمات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر اردو زبان و ادب کی ایک جامع اور مفصل تاریخ کی تحریر و تدوین بھی باقی ہے، مگر اس کا انحصار قدیم شعری و نثری مخطوطات و متون کی دریافت اور ان کی ایک نئی اور سائنٹی فک تدوین پر ہے۔

دورِ جدید میں جدید سائنسی ایجادات، مثلاً: فوٹو اسٹیٹ، مائیکرو فلم، مائیکروفش خاص طور پر حال ہی میں کمپیوٹر اور اس سے وابستہ سہولتوں نے جادۂ تحقیق کو کہیں زیادہ آسان اور ہموار بنا دیا ہے۔ اسی طرح مخطوطات و نوادر کی فہارس کی دستیابی اور مختلف النوع کتابیات کی اشاعت سے بھی رفتار تحقیق تیز اور معیار بہتر و بلند ہونے کی امید پیدا ہو چلی ہے مگر دوسری طرف تہذیب جدید کا مزاج ادبی تحقیق کے لیے سم قاتل ہے۔ دنیاداری،

مادہ پرستی، جاہ طلبی، منفعت پسندی، خوشامد و چاپلوسی اور چال بازی کے اس دور میں کوچۂ تحقیق کا رخ کرنا دل گردے کا کام ہے۔ منصبی مجبوریوں اور معاشی الجھنوں نے اہل قلم سے یکسوئی اور جمعیت خاطر چھین لی ہے۔ پھر ادبی کالموں، رونمائی کی تقریبوں اور فرمایشی تبصروں کی بیساکھیوں کے ذریعے شہرت طلبی کے رجحان نے بھی بہ حیثیت مجموعی ادب کو، اور بہ طور خاص ادبی تحقیق کو نقصان پہنچایا ہے۔

پاکستان اور بھارت میں جامعات ہی اردو میں تحقیق کی تربیت گاہیں ہیں مگر یہی ہماری ادبی تحقیق کا المیہ بھی ہے۔ سینیر اساتذہ کو نہ تو احساس ہے اور نہ ان کے پاس وقت ہے کہ خردوں کی تربیت کر سکیں اور خردوں کے ہاں بھی صبر و استقامت اور محنت و لگن کے ساتھ کام کرنے میں "کاتا اور لے دوڑی" کا شوق مانع ہے، یعنی: "عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب"------ تحقیق جس استقلال، جس صبر، محنت اور توجہ کی طالب ہے، ہم اس سے، اس لیے بھاگتے ہیں کہ "ہمیں تو اب روٹی بھی پکی پکائی ہی اچھی لگتی ہے"۔ [۲۹]

بھارت ہو یا پاکستان، اردو کی ادبی دنیا میں ایسے لوگ ہیں موجود جو تحقیق سے اپنی طبعی اور مزاجی مناسبت کے ساتھ، اس کے تقاضوں کا بھی احساس و ادراک رکھتے ہیں۔ یہی لوگ، اس میدان میں کوئی بات پیدا کر سکتے ہیں۔ اور مستقبل میں ادبی تحقیق کے ضمن میں تمام تر امیدیں انھی سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"لغزشوں اور غلطیوں کے باوجود، میں نئے تحقیق کرنے والوں کے کاموں کو نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ کام نہ کرنے میں ایک عیب ہے اور کام کرنے میں سو عیب۔ کتنا دل گردہ ہے ان نوجوان محققین کا، جو اس اصول سے ترساں نہ ہو کر کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر بے عیب کام کی کوشش میں گھلتے رہیں تو امکان یہ ہے کہ کوئی کام ہو ہی نہ سکے گا"۔ [۳۰]

نگاہیں ایسے ہی لوگوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

(اخبار اردو، اسلام آباد، اپریل ۱۹۸۷ء۔ نظرثانی: مئی ۱۹۹۹ء)

حوالے اور حواشی

۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی: **مقالات تحقیق** : مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور' ۱۹۸۸ء' ص ۹۔

۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی: **کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ**' مکتبہ ادب جدید' لاہور' ۱۹۶۵ء' ص ۹

۳۔ حوالہ ۲' ص ۱۲۔

۴۔ **ادبی تحقیق' مسائل اور تجزیہ** : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' علی گڑھ' ۱۹۷۸ء' ص ۱۱۰۔

۵۔ **ذکرو فکر** از گیان چند' حیدر آباد دکن' ۱۹۸۰ء' ص ۲۲۲۔

۶۔ حوالہ ۲' ص ۱۲۔

۷۔ **کھوج** از گیان چند' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' علی گڑھ' ۱۹۹۹۰ء' ص ۲۰۶۔

۸۔ حوالہ ۵' ص ۱۴۱۔

۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: گیان چند کا مضمون: "بت شکن محقق" مشمولہ: **معاصر قاضی** عبدالودود نمبر (مرتب: کلیم الدین احمد) اگست ۱۹۷۶ء' پٹنہ' ص ۶۵ تا ۱۱۹۔

۱۰۔ حوالہ ۹' ص ۱۱۹۔

۱۱۔ **پرکھ اور پہچان** از گیان چند' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' علی گڑھ' ۱۹۹۰ء' ص ۲۰۵۔

۱۲۔ حوالہ ۴' ص ۱۱۔

۱۳۔ حوالہ ۵' ص ۲۳۵۔

۱۴۔ حوالہ ۷' ص ۲۰۳۔

۱۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی : **ادبی تحقیق** ' مجلس ترقی ادب ' لاہور' ۱۹۹۴ء' ص ۳۲۱۔

۱۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: **تحقیق** (مدیر: نجم الاسلام) شعبہ اردو' سندھ یونی ورسٹی' حیدر آباد' شمارہ ۴' ۱۹۹۰ء۔

۱۷۔ حوالہ: حوالہ ۲' ص [۴]۔

۱۸۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے **کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ** میں مولوی محمد شفیع' پروفیسر شیخ محمد اقبال اور ڈاکٹر سید عبداللہ سے اپنے تلمذ اور علمی تربیت کا ذکر کیا ہے۔ مزید برآں وہ لکھتے ہیں: "راقم الحروف نے تاریخ' فارسی اور اردو کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے"۔ (کتاب مذکور' ص ۱۳)۔

۱۹۔ حوالہ ۱۱' ص ۲۹۴۔

۲۰۔ حوالہ ۱۱، ص ۱۷۲۔

۲۱۔ حوالہ ۱۵، ص ۳۲۔

۲۲۔ مشفق خواجہ: **تحقیق نامہ**، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۸۔

۲۳۔ حوالہ ۵، ص ۱۵۹۔

۲۴۔ ڈاکٹر گیان چند کہتے ہیں: حسینی شاہد کا مقالہ "تحقیقی اعتبار سے اتنا جامع اور بلند ہے کہ ڈی لٹ کی ڈگری اس پر فخر کر سکتی ہے"۔ (حوالہ ۵، ص ۲۷۸)

۲۵۔ حوالہ ۱، ص ۱۳۔

۲۶۔ **پاکستان میں اردو تحقیق : موضوعات و معیار**، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۱۔ رشید حسن خاں کے مرتبہ متون (**باغ و بہار**، **فسانۂ عجائب**، **گلزارِ نسیم**، **مثنویاتِ شوق**) سامنے آنے کے بعد بھی، معلوم نہیں، عقیل صاحب اپنی رائے پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کریں گے یا نہیں؟

۲۷۔ اس پر رشید حسن خاں کا ایک محاکمہ، دیکھیے: حوالہ ۴، ص ۲۵۷ تا ۲۸۸۔

۲۸۔ رشید حسن خاں نے اجتماعی منصوبوں کے تحت ہونے والے کاموں کو "پنچایتی کام" قرار دیا ہے۔

اجتماعی منصوبوں کی ناکامی کے متعدد اسباب ہیں۔ پاکستان میں: "سرکاری امداد و اعانت سے قائم بیش تر ادارے اپنے کام اور مقصد کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اور دیانت سے محروم رہے... [مزید برآں] عام طور پر اداروں کو ایسے افراد کے سپرد کر دیا گیا، جو اس کے اہل ہی نہیں"... (ڈاکٹر معین الدین عقیل: حوالہ ۲۶، ص ۱۴۳)

۲۹۔ حوالہ ۱۵، ص ۱۴۔

۳۰۔ حوالہ ۵، ص ۲۲۶۔

پاکستانی جامعات میں ادبی تحقیق

پاکستان میں تحقیق بڑی حد تک جامعات سے وابستہ ہے۔ ادبیات میں تحقیقی کام کا تقریباً ۸۰ فی صد حصہ جامعات کے طلبہ اور اساتذہ کی کاوشوں پر مشتمل ہے اور اس شعبے میں ہونے والی پیش رفت کا انحصار بڑی حد تک جامعات ہی پر ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جامعات کو اردو زبان و ادب کے مراکز تحقیق کی حیثیت حاصل ہے۔

ا

پاکستان کی جامعات سے، متعدد ایسی شخصیات وابستہ رہی ہیں جن کا نام مختلف زبانوں کے ادبیات کے حوالے سے سند و اعتبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جامعات کے سندی مقالوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے، اور ان میں سے متعدد مقالے شائع ہو کر ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمایے میں قابل قدر اضافے کا باعث بنے ہیں۔ اردو تحقیق میں بہ حیثیت مجموعی، جامعات کا کردار مثالی ہونا چاہیے تھا، مگر افسوس ہے کہ جامعات کے تحقیقی سرمائے کا بڑا حصہ معیاری بھی نہیں ہے۔

تحقیق ادبیات میں مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، عبدالعزیز میمن، سید محمد عبداللہ، غلام مصطفیٰ خاں اور وحید قریشی جیسے اکابر جامعات کی آبرو تھے، مگر جامعات اس پایے کے محققین سے محروم ہو چکی ہیں، اور اس وجہ سے جامعات میں تحقیق کی روایت روبہ زوال ہے۔ قدیم جامعات میں معیار تحقیق کا گراف تیزی سے نیچے گر رہا ہے اور نئی جامعات میں، جہاں سرے سے تحقیق کی کوئی روایت ہی نہیں، تحقیق بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی ہے۔ یہ صورت حال بے وجہ نہیں۔ جامعات کو گوناگوں مشکلات و مسائل کا سامنا ہے، اور ان کا ذکر کیے بغیر، ان تجاویز کی معنویت کو سمجھنا مشکل ہو گا، جو ہم زیر نظر

معروضات کے آخر میں پیش کرنا چاہتے ہیں، مگر سب سے پہلے ایک بنیادی بات:

نہ صرف زوال تحقیق، بلکہ جامعات کے تدریسی اور انتظامی پہلوؤں میں عمومی انحطاط و انتشار کا بنیادی سبب، اقدار کی شکست و ریخت ہے۔ تقریباً تیس برس پہلے سیاسی و سماجی اور معاشی و تمدنی سطح پر ہمارے ہاں جن تبدیلیوں کا آغاز ہوا تھا۔ انھوں نے معیار و اقدار کی دنیا بدل ڈالی ہے۔ ہماری زندگی کی ترجیحات زیر و زبر ہو گئی ہیں۔ پسند و ناپسند کے پیمانے تبدیل ہو گئے اور مادی تقاضے، اخلاقیات پر غالب آ گئے ہیں۔ محنت، دیانت، احساس ذمہ داری، عزم و ہمت اور استقلال مزاج کے بجائے تن آسانی، غفلت، فرض ناشناسی، بددیانتی، محنت سے گریز اور "کاٹا اور لے دوڑی" کا چلن عام ہو گیا ہے۔ کامیابی، ترقی اور سربلندی کے لیے اب علم، محنت اور لگن کے بجائے کچھ دوسرے ذرائع دریافت کر لیے گئے ہیں۔ بلند منصب، بااثر سماجی حیثیت اور شہرت و ناموری کو اولیت حاصل ہے۔ علم اور تحقیق کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ جیسا اوپر عرض کیا گیا، اس صورت حال کا ہمارے عمومی معاشرتی رویوں سے گہرا تعلق ہے اور جب تک ملک گیر سطح پر اجتماعی صورت حال تبدیل نہیں ہوتی، جامعات کے کردار میں کسی بڑی انقلابی تبدیلی کی توقع عبث ہے۔

[جملۂ معترضہ: ادھر چند برس سے پی ایچ ڈی کے لیے ایک بڑا محرک ڈیڑھ ہزار روپے کا پی ایچ ڈی الاونس ہے جو تعلیم و تدریس سے وابستہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلینے والے ہر استاد کو ملتا ہے۔ اس کے باعث لیلاے "تحقیق" کے مجنوؤں کی تعداد میں یکایک غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے]۔

۲

ادبیات میں تحقیق کے مسائل گوناگوں اور متنوع ہیں، ہم صرف اہم مشکلات کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں:

۱: ایک ریسرچ سکالر کے لیے موضوع تحقیق ہمیشہ پہلا بڑا مسئلہ بنتا ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق شدہ اور برائے تحقیق مجوزہ موضوعات کی مکمل فہرستیں دستیاب نہیں ہیں۔

اساتذہ بھی پوری معلومات نہیں رکھتے۔ ایک جامعہ میں کن موضوعات پر کام ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے' دوسری جامعہ کو خبر نہیں۔ [۱۳] بھارت کی پچاس سے زائد جامعات کی تحقیقی سرگرمیوں کے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں۔ اس وجہ سے موضوعات تحقیق میں تکرار ہوتی ہے اور نئے موضوعات حتیٰ کہ بعض اوقات ایم اے کے لیے مناسب موضوعات منتخب اور متعین کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ امیدوار آسان ترین موضوع کی تلاش میں ہوتا ہے' اور چاہتا ہے کہ کسی طرح کی کھکیڑ اٹھائے بغیر' مختصر اور سہل ترین راستے سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہاتھ آ جائے۔ امیدوار کے مخصوص مزاج اور محدود صلاحیتوں کے مطابق موضوع کی دستیابی اور بھی مشکل پیش آتی ہے۔ بیش تر امیدوار' تحقیق کے لائق اور قرار واقعی موضوعات کے قریب نہیں پھٹکتے۔ یہی وجہ ہے سیکڑوں سندی مقالوں کے مقابلے میں تدوین متون کے کام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں' حالانکہ ادبیات کی تحقیق میں بنیادی اور اہم ترین کام متون کی تدوین و ترتیب ہے۔

۲: دوسرا بڑا مسئلہ ایسے نگران اساتذہ کا ہے' جو ادبی تحقیق میں کماحقہٗ راہ نمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اول تو جامعات ایسے اہل علم اساتذہ سے خالی ہوتی جا رہی ہیں' جو فن تحقیق کے رموز سے بھی آگاہ ہوں۔ دوم: راہ نمائی کی اہلیت رکھنے والے جو اساتذہ موجود ہیں' ان کا بیش تر وقت منصبی اور انتظامی امور میں ضائع ہو جاتا ہے۔ سوم: ایک نگران کو بسااوقات دسیوں' بلکہ بیسیوں مقالہ نگاروں کا نگران تحقیق بنا دیا جاتا ہے۔ ایک استاد کو اپنے تدریسی اور متفرق انتظامی اور منصبی فرائض بھی بجا لانے ہوتے ہیں' اس پر بہ یک وقت بہت سے مقالوں کی نگرانی و راہ نمائی کا بارِ گراں لاد دینے کا نتیجہ' معیار تحقیق کی پستی کے سوا کیا ہو گا۔ چہارم: طُرفہ تماشا یہ ہے کہ یونی ورسٹی امیدواران تحقیق سے ان کی رجسٹریشن فیس اور امتحانی فیس وصول کرتی ہے' ممتحنوں کو مقالہ جانچنے کا برا بھلا معاوضہ بھی دیتی ہے' مگر بہ طورِ نگرانِ تحقیق' جو شخص پانچ چھے سال تک مقالہ نگار کو اچھا خاصا وقت دیتا ہے اور مقالے کی درستی میں کچھ نہ کچھ محنت بھی کرتا ہے' یونی ورسٹی اس کے لیے کسی ٹیوشن فیس کا اہتمام نہیں کرتی۔ یونی ورسٹی تمام درجوں کی امتحانی جوابی کاپیوں کی جانچ کا معاوضہ ادا کرتی ہے' مگر پی ایچ ڈی کے مقالے کی راہ نمائی' اور تصحیح و

درستی کا کوئی معاوضہ نہیں۔ گویا نگران کار کے لیے آمادۂ کار ہونے کا ایک اہم محرک موجود نہیں ہے۔

۳: اگر موضوع تحقیق طے ہو گیا' اور نگران کا تقرر بھی ہو گیا' تو اب امیدوار کے لیے ضروری کتابوں اور لوازمے کی فراہمی کا مسئلہ پہاڑ بن کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ کتب خانے غیر مرتب اور منتشر حالت میں ہیں۔ فہارس موجود نہیں یا ناقص اور نامکمل ہیں۔ ایک ایک کتاب کی تلاش میں امیدوار کو نجی اور پبلک کتب خانوں کے بار بار چکر لگانے پڑتے ہیں۔ مطلوبہ کتب کا سراغ مل جائے تو کتب خانے کے قواعد' اس کے اجرا کی اجازت نہیں دیتے۔ کتب خانے میں فوٹو سٹیٹ یا مائیکرو فلم بنوانے کی سہولت موجود نہیں یا پھر طریقۂ کار ہی ایسا پیچیدہ اور مشکل ہے کہ عملاً اس سہولت سے فائدہ اٹھانا ایک صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ پھر دوسرے شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ اور بھی مشکل ہے۔ امیداوار کسی وظیفے کے بغیر مصروف تحقیق ہے (اور ننانوے فی صد ایسا ہی ہے) تو دور دراز کے سفر میں مالی مشکلات آڑے آتی ہیں۔ تحقیق کے ضمن میں' بیرون ملک سفر تو ہمارے ہاں شاید "تعیش" میں شمار ہو گا۔

۴: اگلا مرحلہ (یا مسئلہ اور ایک مشکل بھی)' امتحانی طریقۂ کار کے طول طویل عمل سے گزرنا اور عہدہ برآ ہونا ہے۔ جامعہ میں مقالہ داخل کرنے سے اجرائے سند کے مراحل طے ہونے میں چند ہفتے یا مہینے نہیں' سال ہا سال صرف ہو جاتے ہیں۔ ناظم امتحان' بورڈ آف سٹڈیز' بورڈ فار ریسرچ اینڈ ہائر اسٹڈیز' وائس چانسلر اور پھر ناظم امتحان کے ہاں اتنا وقت صرف نہیں ہوتا' جتنا وقت بیرونی ممتحن مقالہ جانچنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ تین چار ماہ میں جانچا جا سکتا ہے مگر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ممتحن مقالہ دبا کر بیٹھ گیا اور مہینے' بلکہ کئی برس گزار دیے۔ بعض امیدوار اس کا یہ حل نکالتے ہیں کہ مقالہ داخل کرانے کے بعد' اس کا تعاقب کرتے ہیں' اور مقالے کو دھکیلتے ہوئے مختلف مراحل سے گزار لے جاتے ہیں۔ ممتحن کون ہیں؟ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا' چنانچہ امیدوار مختلف ذرائع سے اُن تک رسائی حاصل کر کے' رائے جلد از جلد منگانے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے طالب علم کے لیے یہ کیسی

خواری کی بات ہے۔

۵: امیدوار ہر مقالے کی چار پانچ نقول جامعہ میں داخل کراتا ہے۔ ازروے قواعد' امتحانی مراحل طے ہو جانے کے بعد' یہ مقالے جامعہ کے کتب خانے میں داخل ہونے چاہییں' مگر انتہائی تکلیف دہ امر یہ ہے کہ کم از کم جامعہ پنجاب کی حد تک بیسیوں ایسے مقالوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے' جن کا ایک نسخہ بھی موجود نہیں ہے۔ ہاں' آپ کو انارکلی بازار کے فٹ پاتھ پر ایسا کوئی مقالہ نظر آ جائے' تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

۶: ایک مسئلہ معیاری مقالوں کی اشاعت کا ہے۔ ہماری جامعات' تحقیقی مقالے شاذ و نادر ہی چھاپتی ہیں حالانکہ تھوڑی سی توجہ اور منصوبہ بندی سے منتخب مقالوں کی اشاعت ممکن ہے۔ امیدوار' کوچۂ اشاعت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور یہ کھکیڑ اٹھانا بالعموم ان کے بس کی بات نہیں۔ جامعہ پنجاب کے ایک بہت اچھے مقالے (اردو داستان از سہیل بخاری) کو ۲۴ سال بعد اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔

۳

اس صورت حال میں' سوال یہ ہے کہ پس چہ باید کرد---؟ مختصراً چند تجاویز پیش کرتا ہوں:

۱: کاروبار تحقیق کی تنظیم اور منصوبہ بندی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ کام یو جی سی کا ہے کہ وہ جامعات میں سائنسی' عمرانی اور ادبی تحقیقات کے کام کو منظم کرے۔ ہر شعبے کے ریسرچ بورڈ یا مجالس تحقیق بنائی جائیں۔ تحقیق شدہ اور زیر تحقیق موضوعات کی مکمل فہارس تیار کرا کے تمام جامعات کو مہیا کی جائیں اور شعبوں کو پابند کیا جائے کہ وہ نئے منظور شدہ موضوعات سے دوسری جامعات کے متعلقہ شعبوں کو اور ساتھ ہی یو جی سی کو آگاہ رکھے۔ رموز تحقیق کے شناسا پروفیسروں پر مشتمل' ہر شعبے کی مجلس تحقیق' موضوعات کی تلاش و تعیین اور تحقیق کے طریق کار میں جامعات کی راہ نمائی کرے اور نگرانی بھی۔ ہمارے ہاں زیادہ زور مونوگراف پر دیا جاتا ہے' حالانکہ ادبیات میں بنیادی کام متون پر تحقیق اور ان کی تصحیح و ترتیب کا ہے۔ نامناسب' غیر تحقیقی اور غیر متوازن

موضوعات پر کام کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ بہتر ہو گا موضوعات کے ضمن میں تمام جامعات سے یکساں راہ نما اصولوں کی پابندی کرائی جائے۔ کوئی حرج نہیں کہ ہر شعبے کی مجلس تحقیق بعض موزوں موضوعات کی فہرست تیار کر کے دوسری جامعات کو فراہم کرے۔ (موجودہ صورت حال میں معیار کی ناہمواری اور عدم توازن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک جامعہ میں ایک موضوع پر ایم اے کا مقالہ تیار ہوتا ہے اور کسی دوسری جامعہ میں اسی موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے داد تحقیق دی جا رہی ہوتی ہے)۔ یو جی سی ہر شعبے میں تحقیقی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے کبھی کبھار سیمی نار کا اہتمام کرے تو اس سے جامعاتی تحقیق کے معیار و منہاج کو بہ ہرحال تقویت ملے گی۔

۲ : ہماری جامعات میں ہر طرح کے کام ہوتے ہیں: منصوبے تیار ہوتے ہیں' عمارتیں بنتی ہیں' ادارے قائم ہوتے ہیں اور بڑی بڑی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ مختلف جامعات میں ریسرچ کے کئی کئی ادارے اور مسندیں (chairs) قائم ہیں۔ ان میں سے بعض اداروں نے تو چند ایک قابل قدر کام کیے ہیں' مگر بیش تر اداروں کا کردار کیا رہا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ بعض مسندیں؛ بزرگ اور سبک دوش اساتذہ کی "آرام کرسیاں" بن چکی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہر جامعہ میں نہ سہی' کسی ایک جامعہ میں ایک ایسا مرکز تحقیق قائم ہو جائے یا کوئی ایک یونی ورسٹی لائبریری ہی ایسی ہو' جہاں مختلف زبانوں کی ادبیات اور سماجی و عمرانی علوم سے متعلق' دنیا کے بڑے اداروں کی اہم کتابوں اور مخطوطات کی مائیکرو فلمیں یکجا کر دی جائیں۔ مزید برآں مخطوطات' حوالہ جاتی اور دیگر اہم کتابوں کی' اور رسائل و جرائد کی جامع فہارس (union catalogues) تیار کرا کے تمام جامعات کے کتب خانوں میں مہیا کی جائیں۔

۳ : تحقیق میں پیش رفت کے لیے جامعات کے کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم بھی ناگزیر ہے۔ نئی کتابوں اور لوازمے کے اضافے کے ساتھ' کتب خانوں کے نظام میں اصلاح کی بے حد گنجایش ہے۔ عملے کی کمی یا غفلت سے بعض اوقات ایک کتاب کی تلاش میں کئی کئی گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں ہماری متعدد جامعات میں فوٹو سٹیٹ جیسی عام سہولت بھی میسر نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ کتب خانے کا نظام ایسا ہونا

چاہیے کہ محقق کو مطلوبہ کتاب یا مواد بہ آسانی اور وقت ضائع کیے بغیر، بلکہ حسب ضرورت بذریعہ ڈاک، فیکس، کمپیوٹر، یا انٹرنیٹ بھی میسر آسکے۔

۴: ان کاموں کے لیے وسائل کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں پھر بنیادی مسئلہ وہی ہے کہ قومی سطح پر ہماری ترجیحات کیا ہیں؟ اگر مناسب وسائل مہیا ہو جائیں تو متذکرہ بالا اقدامات کے علاوہ تحقیق کرنے کرانے والے اساتذہ اور طلبہ کو کچھ مراعات دینے کی ضرورت ہے، مثلاً: نگران اساتذہ کے لیے معاوضہ، ریسرچ اسکالروں کے لیے وظائف، بیرونِ شہر سے آنے والوں کے لیے سستی قیام گاہیں، بہ سلسلہ تحقیق سفری سہولیات، خصوصاً بیرون ملک سفری اخراجات میں معاونت، مقالے کی نقول تیار کرانے میں کم لاگت پر فوٹوسٹیٹ کی سہولت وغیرہ۔

۵: معیارِ تحقیق کی پستی کا ایک سبب ہمارے ممتحنوں کا یہ عجیب و غریب رویہ بھی ہے کہ وہ کسی مقالے کی جانچ کے بعد اسے علیٰ حالہٖ بلکہ بعض اوقات، کسی صورت میں بھی، قابلِ اشاعت نہیں سمجھتے مگر اس پر ڈگری کی سفارش کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی تحقیقی مقالہ، اشاعت پذیر ہو کر قارئین کو منہ دکھانے کے قابل نہیں (اور ایسے بیسیوں ہوں گے!) تو اسے منظور ہی کیوں کیا جاتا ہے؟ لہٰذا صرف ایسے مقالوں پر سند دی جائے جو علیٰ حالہٖ (یا معمولی فروگذاشتوں کی تصحیح کے بعد) قابلِ اشاعت ہوں۔[۲]

۶: تحقیق کے خواہش مند بیش تر امیدوار لکھنے پڑھنے میں خام اور مبادیاتِ تحقیق سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ جامعات میں ماقبلِ تحقیق (pre-research) کورس کا اجرا ضروری ہے۔ تحقیق کی عمومی تربیت کے علاوہ بعض مخصوص کورس (جیسے: مخطوطہ شناسی وغیرہ) بھی شروع کیے جائیں۔ اس ابتدائی تربیت کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد ہی امیدوار کو بہ طور ریسرچ اسکالر رجسٹر کیا جائے۔

۷: اب یہ شکایت بھی سننے میں آتی ہے کہ بعض امیدوار، معاوضے پر مقالہ لکھوا کر سند حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ زبانی امتحان (viva-voce) امتحان کے بجائے ایک رسمی دفتری کارروائی بن کر رہ گیا ہے۔ بعض غیر ملکی جامعات کی طرح، امیدوار کو کیوں نہ پابند کیا جائے کہ وہ زبانی امتحان کے موقع پر

اساتذہ، طلبہ اور دیگر اہل علم کی مجلس کے سامنے اپنی تحقیق کا دفاع کرے؟ تاکہ اندازہ ہوسکے کہ امیدوار کتنے پانی میں ہے؟ مقالے میں اس کی اپنی کاوش اور محنت کا کس حد تک دخل ہے اور دوسروں کا خونِ جگر کس حد تک شامل ہے۔ [۳]

۴

بہ حیثیت مجموعی، جامعات میں تحقیق کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں، بلکہ بڑی حد تک حوصلہ فرسا اور دل شکن ہیں۔ سہولتوں کی بے حد کمی ہے اور عملی سطح پر اساتذہ اور طلبہ کو گوناگوں دِقّتوں کا سامنا ہے لیکن ہمیں امید کا دامن، بہ ہر حال نہیں چھوڑنا چاہیے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ راقم کا تعلق جامعہ پنجاب کے شعبۂ اُردو سے ہے، اور یہ معروضات، زیادہ تر، ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پیش کی گئی ہے۔ [۴]

(یہ مضمون انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، کے زیر اہتمام "پاکستان میں جامعات کا کردار" کے موضوع پر ایک سیمی نار: ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء میں پیش کیا گیا۔ مشمولہ: پاکستان میں جامعات کا کردار، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء)۔

حوالے اور حواشی

۱۔ جناب جمیل الدین عالی بتاتے ہیں: ایک زمانے میں وفاقی وزیر تعلیم کے زیر صدارت ایک اجلاس میں طے ہوا کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے تحت جامعات کے تمام پی ایچ ڈی اور ایم فل مقالوں کی فہرستیں مقررہ وقفوں کے ساتھ شائع کی جائیں، مگر یہ اہم فیصلہ روبہ عمل نہ آسکا۔ (حرفے چند: پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات و معیار از ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲)۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے سندی مقالات کی ایک تفصیل مہیا کی ہے، دیکھیے ان کی تالیف: اردو تحقیق، یونی ورسٹیوں میں، یونی ورسل بکس لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۲۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں ایم فل اقبالیات کا آغاز ہوا تو شعبۂ اقبالیات نے ازراہ عنایت مجھے بھی بعض مقالات جانچنے کے لیے بھیجے۔ معروف روایت کے مطابق' رپورٹ میں' میں یہ بھی لکھ دیتا تھا کہ مقالہ قابل اشاعت ہے (یا نہیں)۔ اس پر ارباب یونی ورسٹی کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی کہ آیندہ رپورٹوں میں' کسی مقالے کے قابل اشاعت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے۔

۳۔ ہماری جامعات میں' بہ قول جمیل الدین عالی: "غلط بخشی کی مثالیں عام ہیں" (حوالہ ا' ص ۳)۔

بھارت میں ادبی اور لسانی تحقیق

خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری پٹنہ' برعظیم پاکستان' بنگلہ دیش اور بھارت کا ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ اب تو یہ 'علمی و ادبی تحقیق کا ایک ایسا ادارہ بن چکا ہے' جو کم از کم اردو ادب اور تحقیق و تنقید کے شعبے میں برعظیم کی بہت سی جامعات سے بھی زیادہ وقیع اور ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کا سہ ماہی جرنل 'اردو کے چوٹی کے علمی مجلّوں میں شمار ہوتا ہے۔ علمی نوادر' غیر مطبوعہ خطوط' تصاویر' نایاب کتابوں اور دستاویزات کا ایک بڑا ذخیرہ اور تحقیقی و تنقیدی مقالات کی ایک بڑی تعداد اس کی وساطت سے سامنے آئی ہے۔ یہ ادارہ متعدد قومی اور بین الاقوامی اجتماعات بھی منعقد کرا چکا ہے۔ ان سب کاموں میں کتب خانۂ مذکور کے بیدار مغز ڈائرکٹر' ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی مساعی کو بہت دخل ہے۔[۱] اب انھوں نے پٹنہ ہی سے ادارہ تحقیقات اردو کے زیر اہتمام معیار و تحقیق کے نام سے ایک نیا تحقیقی و علمی مجلّہ جاری کیا ہے' جس کا دوسرا شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے (۱۹۹۱ء' ۹۲۰ صفحات)۔

پیش گفتار میں بیدار صاحب نے بتایا ہے کہ ادارے نے قاضی عبدالودود کی یاد میں جس "اردو ریسرچ کانگریس" کی بنا ڈالی ہے' جس میں ہر سال اردو کے تحقیقی مقالوں کے جائزے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ دو تین سال میں اس طرح کے جو جائزے تیار ہوئے' انھیں زیر نظر مجموعے کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارے نے اردو زبان و ادب سے متعلق پی ایچ ڈی کے ۵۵ تحقیقی مقالوں پر نامور محققوں' نقادوں اور جامعات کے اساتذہ سے جائزے لکھوائے' پھر یہ جائزے متعلقہ مقالہ نگاروں کو بھجوا کر' ان کے جوابات حاصل کیے۔ اب ان جائزوں اور جوابات کو یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ کچھ جائزے مفصل ہیں اور بہت کاوش و محنت سے تحریر کیے گئے ہیں'

مثلاً: پروفیسر عتیق احمد صدیقی کے مقالے قصائد سودا کا جائزہ از ڈاکٹر محمد انصار اللہ (۵۶ صفحات) ڈاکٹر محمد زمان آزردہ کے مقالے مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے کا جائزہ از ڈاکٹر ذکیہ جیلانی (۳۷ صفحات) ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے مقالے حضرت شاہ اکبر دانا پوری کا جائزہ از شمیم منعمی (۹۰ صفحات) ڈاکٹر عابد پیشاوری کے مقالے انشاء اللہ خاں انشا کا جائزہ از ڈاکٹر گیان چند (۱۴ صفحات) وغیرہ۔ اس کے برعکس بعض جائزے بہت مختصر اور سرسری ہیں، محض خانہ پری۔ بعض جائزوں میں تحقیق ہے نہ تنقید، محض تعارف۔ ان جائزوں کے جواب میں بعض مقالہ نگاروں نے تو بالکل چپ سادھ لی اور باوجود بار بار کی یاد دہانیوں کے، بے نیازانہ خاموشی روا رکھی۔ ایک صاحب نے اپنے مقالے پر ۵۸ صفحاتی جائزے کے جواب میں صرف یہ لکھا: "میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا، اور یہی مکرّر عرض ہے" (ص ۱۲۱)۔ ایک تحقیق کار نے جائزہ نویس کی گرفت کو "منفی تنقید" قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں "نیک نیتی کو ہرگز ہرگز دخل نہیں" (ص ۴۱۵)۔ بلاشبہ بعض جائزوں میں "منفی تنقید" کے جراثیم نظر آتے ہیں یا کم از کم جائزہ نگار کے انداز سے، اس کی نیک نیتی مشکوک ہو جاتی ہے (جیسے: عنوان چشتی کا جائزہ)۔ ایک صاحب نے جائزہ نگار کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھیں بار بار "عزیزی سلّمہٗ" کہہ کر اپنی بزرگی کا احساس دلایا ہے (ص ۴۱۴ ومابعد)۔ ایک صاحب نے کسی اعتراض کا جواب تو نہیں دیا مگر تنبیہہ کی ہے کہ مستقبل میں ایسے تبصروں سے احتراز کریں، ورنہ علم و تحقیق سے انصاف نہیں ہو گا۔ (ص ۷۲۵) بعض بزرگوں نے اپنے اوپر تنقید کا بہت برا مانا اور شدید ردعمل ظاہر کیا، مثلاً: ایک صاحب نے جائزہ نگار کے لیے یہ شعر ارسال کرتے ہوئے، امید ظاہر کی ہے کہ ایڈیٹر، جائزے کے ساتھ اس شعر کو "ضرور شائع فرمائیں گے"۔ (ص ۱۲۷):

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکّب، ابدُ الدّہر بماند

ایک اور بزرگ نے اپنے مقالے پر (جو کتابی صورت میں کئی بار چھپ چکا ہے) تبصرے کو ناپسند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مبصر کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں، انھیں یہ حق نہیں پہنچتا

کہ وہ دوسروں کو ہدایات دیں کہ اس طرح نہیں، اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔ یہ کتاب نصف صدی سے بار بار چھپ رہی ہے اور کئی یونی ورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ آخر میں انھوں نے ازراہ تعجب یہ سوال کیا ہے کہ ریسرچ کانگریس نے یہ تبصرہ اپنے اجلاس میں پڑھنے کی اجازت کیوں دی؟ (ص ۴۷۷) ایک اور صاحب نے مبصر کے "طفلانہ اعتراضات" کا دفاع کرتے ہوئے، اپنا جواب ان الفاظ پر ختم کیا ہے: "اگر زبان و ادب پر کام کرنا ہے تو بے علمی، بہتان تراشی، بددیانتی اور خفیف الحرکاتی کو ترک کرنا ہو گا"۔ (ص ۶۱۷)

بعضوں نے بڑی فراخ دلی سے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا ہے، جیسے: "میں ایک پردہ نشین خاتون ہوں، کالج میں پڑھاتی ہوں اور بے حد گھریلو ذمہ داریاں ہیں اس لیے میرے لیے مختلف شہروں میں جا کر اپنے مقالے کلب حسین خاں نادر، حیات اور کارنامے کے لیے مواد فراہم کرنا مشکل تھا"۔ (ص ۵۸۸) ڈاکٹر گیان چند اپنی ایک ایسی "فاحش غلطی" ریکارڈ پر لے آئے، جو اُن کے مبصر کی نظروں سے بھی اوجھل رہی تھی۔ (ص ۲۰۰) کھلے دل سے اپنی غلطی کے اعتراف سے انسان کی عظمت اور وقار میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے (مگر یہ بات بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے)۔ بہ حیثیت مجموعی کئی حضرات (ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ) نے بڑے تحمل اور حوصلے سے متوازن جوابات دیے ہیں۔

آخر میں مجموعی جائزوں کی صورت میں تین مضامین شامل ہیں، اول: "اردو ناول پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالے" از ڈاکٹر ہارون ایوب، یہ مضمون بہت سرسری اور تشنہ ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کے "تحقیقی" مقالے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے: "صحیح معنوں میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے"۔ (ص ۷۸۱) ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے ممنون دہلوی کا دیوان مرتب کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ (ص ۶۴) [یہ "حق تحقیق" ادا کرنا بھی کیسا سہل کام ہے۔ **فاعتبروا یااولی الابصار**]

دوم: "سودا کے کلام پر تحقیق" از فرخ جلالی، اور سوم: "یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق کی رفتار" کا جائزہ از ڈاکٹر کلیم الحق قریشی۔ اس میں بعض باتیں توجہ اور غور کے

لائق ہیں، مثلاً: یونی ورسٹیوں کے مقالوں کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو سوائے چند ایک کے، باقی تمام مقالے "تحقیق" کی عبرت ناک مثال ہوں گے۔ (ص ۷۹۹) زندہ لوگوں پر تحقیقی کام ہرگز نہ کیا جائے۔ (ص ۸۰۱) مالک رام کا خیال ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں بھارت کی یونی ورسٹیوں میں کوئی خاص تحقیقی کام ہوا ہی نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نہایت مایوس کن ہے۔ (ص ۸۰۳) اور سوال یہ ہے کہ اب تک کسی یونی ورسٹی میں کسی مقالہ نگار کا مقالہ مسترد بھی ہوا ہے؟(ص ۸۰۴) وغیرہ۔

یہاں ایک تصحیح ضروری ہے۔ ڈاکٹر کلیم الحق قریشی نے لکھا ہے کہ برعظیم میں اردو ادب پر پی ایچ ڈی کی پہلی سند ڈاکٹر محمد صادق کو ۱۹۳۹ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ملی تھی۔ (ص ۸۰۰) حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں پہلی سند، ۱۹۳۱ء میں کلکتہ یونی ورسٹی سے موہن سنگھ دیوانہ کو تفویض ہوئی تھی۔ ان کا موضوع تھا:

Some Characteristics and Tendencies of Modern Urdu Poetry 1867 to 1925.

[جدید اردو شاعری کی بعض خصوصیات اور رجحانات، ۱۸۶۷ء تا ۱۹۲۵ء]۔[۲]

ڈاکٹر محمد صادق کی سند، پنجاب یونی ورسٹی سے اردو ادب سے متعلق پہلی پی ایچ ڈی ہے۔ ان کے اصل مقالے کا عنوان ہے:

Muhammad Hussain Azad: His Life, Works and Influence

بعدازاں اسے بہت سی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اردو میں بھی، بہ عنوان محمد حسین آزاد: احوال و آثار شائع کیا گیا ہے۔[۳]

معیار و تحقیق کے اس شمارے میں جن ۵۵ مقالوں کا جائزہ لیا گیا ہے، ان میں سے صرف تین کا تعلق پاکستانی جامعات سے ہے۔ اس طرح بنیادی طور پر یہ بھارت میں اردو کی ادبی و لسانی تحقیق کا جائزہ ہے۔ آخر میں بھارت اور پاکستان کے سندی مقالوں اور تحقیقی کتابوں کی فہارس بھی شامل ہیں۔

اردو تحقیق کا یہ جائزہ، اپنی نوعیت میں بالکل نئی چیز ہے۔ یہ ایک ایسا دل چسپ اور (ایک لحاظ سے عبرت ناک) مجموعہ مضامین ہے، جسے جامعات کے اساتذہ، تحقیق کے ذمہ

داروں اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے ادب دوستوں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ نئے تحقیق کاروں کو بھی اس جائزے سے اندازہ ہو گا کہ راہ تحقیق کے نشیب و فراز کیا ہیں؟ اور اس راہ کے "دو چار بہت سخت مقامات" سے گزرنے میں کیا کیا احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار (اور ان کے رفقا) اردو ریسرچ کانگریس کے انعقاد' اور اس سے متعلقہ لوازمے (مواد) کی فراہمی اور زیر نظر شمارے کی صورت میں اس کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اردو میں ادبی اور لسانی تحقیق کے ضمن میں یقیناً یہ ایک بڑا جرأت مندانہ عمل ہے۔ اردو تحقیق کے مستقبل پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

معیار و تحقیق کے اس شمارے کو دیکھنے کے بعد' قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں اب تک کسی ایسی ریسرچ کانگریس کا اہتمام کیوں نہ ہو سکا؟ ہم اپنے "عمل کا حساب" کرنے سے کیوں گریزاں ہیں؟ نگاہیں انجمن ترقی اردو پاکستان' اکادمی ادبیات پاکستان' مقتدرہ قومی زبان اور جامعات کے اردو شعبوں کی طرف اٹھتی ہیں' کہیں سے کوئی جواب-----؟

(ماہنامہ **قومی زبان** کراچی' مارچ ۱۹۹۳ء۔ مدیر نے آخری پیرا' قلم زد کر دیا تھا)۔

حواشی

۱۔ بیدار صاحب کی سبک دوشی کے بعد' حبیب الرحمٰن چغانی صاحب ڈائرکٹر اور مدیر جرنل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۲۔ **تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور** از ڈاکٹر غلام حسین [ذوالفقار] اورینٹل کالج لاہور' ۱۹۶۲ء' ص ۱۷۵' نیز: **منتخبات نثر اردو** (۱۸۶۷ء۔۱۹۲۵ء) از موہن سنگھ دیوانہ' لاہور آرٹ پریس لاہور [۱۹۳۱ء] --- اور: **اردو تحقیق' یونی ورسٹیوں میں** از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن' یونی ورسل بکس لاہور' ۱۹۸۹ء' ص ۲۲ تا ۲۵۔

۳۔ انگریزی مقالہ ۱۹۵۶ء میں چھپا' پھر ۱۹۷۴ء میں ویسٹ پاکستان پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ لاہور نے شائع کیا۔ اردو کتاب کی اشاعت' مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی۔

اُردو میں سوانح نگاری

ایک ایسی قوم کے ادب میں، جو ایک پُرشکوہ اور باعظمت ماضی کے احساس سے سرشار اور اسماء الرجال جیسے فن کی موجد و ماہر ہو، سوانحی ذخیرے کی کمی کا شکوہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن اُردو زبان میں دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں سوانح عمری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ عہد سرسید سے پہلے اُردو نثر عہد طفولیت میں تھی مگر سوانح نویسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک لمبی مسافت کی دھوپ چھاؤں سے گزری ہے، چنانچہ اُردو کے نثری ادب میں سوانح عمریوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ملتا ہے، جس میں ہر نوع، کم و کیف اور عیار و اعتبار کی سوانح عمریاں ملتی ہیں۔

۱

اُردو تنقید کی طرح سوانح نگاری میں بھی اولیت کا اعزاز مولانا حالی ہی کو حاصل ہے۔ صرف اولیت ہی نہیں، قدر و منزلت میں بھی حالی کی سوانح عمریاں خصوصاً حیات جاوید (۱۹۰۱ء) اُردو کے سوانحی ادب میں، پہلے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقی معنوں میں یہی اُردو کی پہلی باضابطہ اور باقاعدہ سوانح عمری ہے۔

حیات جاوید کی تالیف سے پہلے حالی حیات سعدی (۱۸۸۶ء) اور یادگار غالب (۱۸۹۷ء) لکھ چکے تھے۔ ان دونوں کتابوں کے تالیفی مرحلوں سے گزرتے ہوئے، ان کا سوانحی شعور برابر ارتقا پذیر رہا، چنانچہ ان کا فن حیات جاوید ہی میں سامنے آیا ہے۔ اس میں پہلی بار، اپنے عہد کے ایک بڑے انسان کی لائف کو، ایک بڑے اصلاحی مقصد اور قومی و ملی شعور سے ہم آہنگ اور مربوط کر کے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور مغربی ادبیات کے، محدود سے مطالعے اور تاثرات سے حاصل ہونے والی تحقیقی و تصنیفی سمجھ بوجھ کو کام میں لایا گیا ہے۔ دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوانح عمری کا

باقاعدہ ایک تصور ان کے ذہن میں تشکیل پا چکا تھا۔

مولانا حالی، مغربی سوانح نگاری کی تقلید میں، سرسید کی شخصیت کے تشکیلی عوامل (نسلی جبلت، ماں کی تربیت، سیاسی حالات، مذہب، شادی، بھائی کی وفات، شاہ غلام علی سے عقیدت وغیرہ) کے گوناگوں اثرات کا پتا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سرسید کی جسمانی اور دماغی قابلیت، دو اجنبی خاندانوں میں پیوند ازدواج کا نتیجہ ہے۔ یوں انھوں نے سماجیات و عمرانیات سے اپنی واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔[۱] اس اعتبار سے بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''سوانح نگاری کے فن میں حیات جاوید بجا طور پر پہلی منظم اور کامیاب کوشش ہے''۔[۲]

بہ ایں ہمہ حیات جاوید شبلی کی شدید تنقید کا نشانہ بنی۔ اس تنقید کی دوسری وجوہ بھی ہوں گی، مگر ایک حد تک اس کا سبب حالی کے اپنے بیانات ہیں، مثلاً دیباچہ میں ایک طرف تو کہتے ہیں کہ:

''وہ ہم میں پہلا شخص ہے، جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی، اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے، اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعوی ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لیے ضرور ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے''۔[۳]

مگر دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیاگرافی کریٹی کل طریقے سے لکھی جائے، اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں، اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی دکھائی جائیں''۔[۴]

کچھ سرسید کا اثر، اور کچھ شاید مغربی خیالات کے سبب حالی نے ''نکتہ چینی'' کو سوانح عمری کا لازمہ قرار دیا، مگر عملاً حالی جیسے شریف النفس اور مرنجان مرنج شخص کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ کریٹی کل انداز اختیار کرتے۔ ہیرو کی لغزشوں اور کمزوریوں کے اظہار و

بیان کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا۔ حالی تو مصلحت و مصالحت کے بندے تھے۔ بہ ہرصورت سوانح عمری کے بارے میں ان کے اپنے متضاد بیانات نے ان کے لیے مشکلات پیدا کردیں' اور وہ اپنے نظریات پر قائم نہ رہ سکے۔

بلاشبہ حیاتِ جاوید میں خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں' اس کے باوجود حالی کا ذخیرہ سوانح عمری قابلِ ستایش اور بہت سے مابعد سوانح نگاروں کے لیے لائق رشک ہے۔ جو کچھ وہ نہیں کر سکے' اس کے لیے انھیں معذور سمجھنا چاہیے۔

شبلی نے قدیم انداز سوانح نگاری [مبالغہ' عقیدت مندی' خوش اعتقادی] سے ہٹ کر حقیقت پسندی پر زور دیا۔ ایک جگہ وہ بعض بزرگوں سے منسوب کرامتوں کو افسانے اور دور ازکار قصے قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں' نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے۔ شبلی کی سوانح نویسی کے باب میں اہم بات یہ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروقؓ ایسی مقدس ہستیوں کے سوانح نگار ہیں مگر ممدوحین کی بشری کمزوریوں کو چھپانے کے قائل نہیں' بلکہ انھیں انسانی فطرت کا حصہ سمجھتے ہوئے سامنے لاتے ہیں۔ مزید برآں انھوں نے حالی کی "کان کنی" کی روایت کو آگے بڑھایا۔ سیرۃ النبیؐ (۱۹۱۴ء' اشاعت: ۱۹۱۸ء) اور الفاروق (۱۸۹۹ء) کی تالیف میں شبلی نے تلاش و تفتیش اور تحقیق و تدقیق میں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بہ قول ڈاکٹر سید شاہ علی: "حیات جاوید کے بعد جامعیت و تکمیل وغیرہ کے لحاظ سے اُردو کی نوتعمیری اور تجدیدی سوانح عمریوں میں اگر کسی کتاب کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ الفاروق ہے"۔[۵]

بعض معاصر' اور مابعد سوانح نگاروں پر کئی پہلوؤں سے حالی اور شبلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مثلاً سیاسی و سماجی پس منظر' مغربی مصنفین سے استفادہ' ہیرو کے گوناگوں کارناموں اور قومی ترقی و احیاے ملی پر زور وغیرہ۔ محمد عبدالرزاق کان پوری کی محققانہ کاوش البرامکہ (۱۸۹۶ء) پر حالی اور شبلی کا معنوی فیضان واضح ہے۔ اس کے دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شبلی کے ہیروز آف اسلام کے سلسلے کو ایک طرح کا ماڈل سمجھتے تھے۔ اس دور میں خلفاے راشدین کی متعدد چھوٹی بڑی سوانح عمریاں' بڑی حد تک

شبلی کے زیر اثر لکھی گئیں۔ شبلی کی روایت میں عبدالحلیم شرؔر نے مشاہیر اسلام کا سلسلہ شروع کیا، مگر استناد و معیار میں ان کا مقام فروتر ہے، بلکہ یہ کہنا موزوں ہو گا کہ تحقیقی اعتبار سے ان کا کوئی پایہ ہی نہیں ہے۔ روایت و درایت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ افسانہ ؤ افسوں کو بھی تاریخ کا جز بنانے سے نہیں ہچکچاتے۔

بیسویں صدی کے پہلے دو تین عشروں میں چھوٹی بڑی سیکڑوں سوانح عمریاں وجود میں آئیں جن پر مشرقی اخلاقیات اور تہذیب و شائستگی کے عمومی تصورات کا غلبہ ہے۔ ان میں بہت کچھ ہے: اصلاحی جذبات، مناظرانہ رنگ، کرامات کا بیان اور قیاس آرائیاں جو واللہ اعلم بالصواب پر ختم ہوتی ہیں۔ ہیرو کے ناگفتنی پہلو تو خوف فساد خلق سے ناگفتہ ہی رہ گئے، ہاں، سب میں ہیرو پرستی کا جذبہ بہت نمایاں ہے۔ البتہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصوری پوری نے رحمتہ للّعالمین (۱۹۱۲ء) میں تلاش و تحقیق کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ اس دور کی کسی اور سوانح عمری میں نظر نہیں آتا۔ ایک تو موضوع سے مصنف کی جذباتی وابستگی، دوسرے تورات و انجیل پر عبور، مختلف علوم پر دسترس، پھر تحقیق کی سائنٹی فِک منہج اور کام کی لگن، نتیجہ یہ کہ مصنف اُردو کو ایک اعلیٰ درجے کی سیرت النبی عطا کر کے اپنے لیے عاقبت کا سامان مہیا کر گئے۔

اس زمانے کے بعض سوانح نگاروں نے سرسید، حالی اور شبلی کی کاوش اور کان کنی کی روایت سے فائدہ اٹھایا جس کے نتیجے میں متعدد اچھی سوانح عمریاں وجود میں آئیں، جیسے: حیات النّذیر (افتخار عالم، ۱۹۱۲ء) وقارِ حیات، (اکرام اللہ ندوی، ۱۹۲۸ء) سیرتِ محمد علی (رئیس احمد جعفری، ۱۹۳۴ء) حیاتِ دبیر (افضل حسین ثابت لکھنوی، ۱۹۳۱ء) حیاتِ اجمل (حکیم رشید احمد خاں، ۱۹۳۷ء) سیرت سید احمد شہید (ابو الحسن علی ندوی، ۱۹۳۹ء) آثارِ جمال الدین افغانی (قاضی محمد عبدالغفار، ۱۹۴۰ء) وغیرہ۔

گیان چند لکھتے ہیں: "غالب کے تعلق سے تین اہم ترین سوانحات، بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سامنے آئیں"۔ [۶] غلام رسول مہر نے سوانح کے مروج انداز و منہج سے ہٹ کر مرزا غالب کے سوانح پر قلم اٹھایا (غالب، ۱۹۳۶ء)۔ بہ قول دیباچہ نگار: "مہر

صاحب نے سوانح عمری کی ایک تیسری قسم ایجاد کی ہے کہ صاحب سوانح کے کلام نظم و نثر اور اس کی نجی تحریروں سے اس کے حالات زندگی فراہم کیے ہیں"۔ (عبدالمجید سالک) اس کے استناد میں شبہ نہیں، مگر ایک منظم و مربوط سوانح عمری کے بجائے، اسے "سوانحی مواد" کہنا صحیح ہو گا۔ شیخ محمد اکرام کا غالب نامہ (۱۹۳۶ء) اس کا ردعمل ہے اور اس کی تکمیل بھی۔ مصنف نے "جدید سیرت نگاری کے تقاضوں" کا خیال رکھتے ہوئے، غالب کے ذہنی ارتقا، نفسیاتی و اردات اور باطنی کش مکش کو خارجی احوال و واقعات سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے اپنی دوسری کاوش شبلی نامہ کے ذریعے بھی سوانح نگاری کا ایک نیا تصور دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ اختصار و جامعیت، نیز: "اعتدال اور توازن اور جدید سوانحی نقطۂ نظر کی ایک ہلکی پھلکی لیکن مستقل سوانح عمری کا نمونہ ہے۔ مصنف نے شبلی کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ان کی شخصیت اور رجحانات کے ارتقا کے مدارج میں مختلف اثرات کا مستند ذرائع سے سراغ لگانے کی کوشش کی ہے"۔[۷] بعدازاں انھوں نے اسے "بالکل نئے سرے سے ترتیب" دیتے ہوئے یادگار شبلی (۱۹۷۱ء) کے نام سے شائع کیا۔

مالک رام کی تحقیقی کاوش ذکر غالب (۱۹۳۸ء) اپنے دور اور غالب کی سوانح عمریوں میں قابل لحاظ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک محققانہ، مسرت بخش، مختصر مگر جامع سوانح ہے۔[۸]

اسی کے متوازی سوانح نگاری کی وہ روایت بھی جاری و ساری نظر آتی ہے جو حالی اور بہ طور خاص شبلی سے شروع ہوئی تھی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اس کا امین بنا، اور اس کی علم برداری کا بیڑا اٹھایا۔ دارالمصنفین کے متعدد سوانح نگاروں نے اس روایت کی آبیاری میں ایک علمی ولولے کے ساتھ حصہ لیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین کے تمام سوانح نگاروں میں، سرکشیدہ نظر آتے ہیں اور کیوں نہ ہو، وہ شبلی کے شاگرد خاص اور صحبت یافتہ تھے اور ان کے معاون تحقیق بھی رہے۔ اول: سید سلیمان کا بڑا کارنامہ سیرت النبی کی تدوین و تکمیل ہے۔ دوم: انھوں نے حیات مالک، سیرت عائشہؓ اور حیات شبلی لکھ کر حیات جاوید، الغزالی اور الفاروق کی روایت کو آگے بڑھایا۔ حیات شبلی (۱۹۴۳ء) کریٹی کل نہیں ہے کیوں کہ شبلی کے

بارے میں، سید سلیمان ندوی جیسے شاگرد کی لکھی ہوئی بایوگرافی کریٹکل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ درست ہے کہ حیات جاوید کے بعد یہ اردو کی ایک جامع، مفصل اور وقیع سوانح عمری ہے۔ دارالمصنفین کے بعض دیگر سوانح نویس (جیسے: عبدالسلام ندوی) شبلی اور سید سلیمان کی روشن کردہ مشعل کو تھامے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ [۹]

ابوالحسن علی ندوی، سید سلیمان کے عزیز ترین تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے سیرت سید احمد شہید میں جملہ دستیاب مصادر کی مدد سے اوسط درجے کی ایک عالمانہ سوانح عمری تیار کی جس میں سید سلیمان کے تلمذ و علمی تربیت اور ندوہ و اعظم گڑھ کی تالیفی روایات کے اثرات واضح ہیں۔ بعدازاں انھوں نے کچھ اور سوانح عمریاں بھی شائع کیں، جیسے: **سوانح عمری حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری** (۱۹۶۵ء)، **حیات عبدالحی** (۱۹۷۰ء) اور **سوانح حضرت مولانا محمد زکریا** [۱۹۸۲ء] وغیرہ، مگر ان کے ہاں عقیدت مندانہ رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ [۱۰]

بہ حیثیت مجموعی شبلی و سلیمان کے جانشین دارالمصنفین کی روایت کا اعتبار قائم نہیں رکھ سکے (کجا یہ کہ وہ اسے ایک بہتر و برتر معیار تک لے جاتے)۔ اس کی ایک مثال شاہ معین الدین احمد ندوی کی **حیات سلیمان** (۱۹۷۳ء) ہے۔ اس میں حیات کا پہلو مختصر اور کمزور ہے۔ کسی تفصیل کی تلاش و سعی نظر نہیں آتی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو جو لوازمہ، جہاں سے بھی اور جیسا کچھ بھی مل گیا، اسے سوانح عمری میں شامل کر لیا۔ زیادہ تر لوازمہ ذاتی یادداشتوں، بعض اصحاب کی زبانی روایتوں، ممدوح کے خطوط اور **معارف** کے مندرجات کے ایک طومار (۷۲۹ صفحات) پر مشتمل ہے۔ مصنف کا انداز نظر "ایک جلیل القدر شخصیت اور شفیق استاد--- [کے] ایک ادنیٰ شاگرد" کا ہے، اس لیے ظاہر ہے یہاں حالات و واقعات پر کسی طرح کی تنقید یا شخصیت کے تجزیہ و تحلیل کی کوئی گنجایش نہیں۔ مصنف نے "حتی الامکان [اپنے تئیں] صاحب سوانح کی صحیح تصویر" پیش کر دی ہے (مقدمہ)۔ سوال یہ ہے: کیا سید سلیمان مُبرّا عَنِ الخطا تھے؟ شاہ معین الدین احمد صاحب نے ان کی کسی شخصی کمزوری، کوتاہی یا غلطی کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ بہت سی دوسری سوانح عمریوں کی طرح **حیات سلیمان** میں بھی سوانحی تفصیل سے زیادہ،

ممدوح کی علمی اور ملی کارناموں پر زور دیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے تئیں حیات شبلی کا نمونہ سامنے رکھا، مگر سید سلیمان کا ذہن اور قلم کہاں سے لاتے۔ فرق دراصل شخصیتوں کا فرق ہے۔ بہ ہر حال حیات شبلی کے بعد حیات سلیمان سوانح عمری کے باب میں دارالمصنفین کے سفر معکوس کی ایک مثال ہے۔

اس کے برعکس غلام رسول مہر کی سیرت سید احمد شہید (۱۹۵۲ء) تحقیق و تدقیق اور تلاش و کاہش کی عمدہ مثال ہے۔ فی الحقیقت انھوں نے حالی اور شبلی کی "کان کنی" کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مصنف نے علاوہ دیگر مآخذ تک رجوع و رسائی کے، کئی بار بالاکوٹ کا سفر کیا اور اپنی تحقیق کو زیادہ مستند بنانے کی کوشش کی۔ ان کی محنت و عرق ریزی قابل داد ہے، لیکن مہر صاحب نے کریٹی کل ہونے سے احتراز کیا ہے۔ وہ ممدوح کی جملہ کمزوریوں اور غلطیوں کا حسب موقع ذکر و اعتراف، مگر ساتھ ہی ان کی وکالت بھی کرتے ہیں، جو بعض جگہ بالکل بے جواز نظر آتی ہے۔ اگر وہ ایک معروضی اور ہمدرد سوانح نگار کے مقام سے نیچے اتر کر ہیرو کے وکیل نہ بن جاتے تو بہ طور سوانح عمری، اس کتاب کا پایہ کہیں بلند ہوتا۔ بلاشبہ سید احمد شہید نے اپنی انقلابی، متحرک اور پرکشش شخصیت سے مجاہدین کی ایک ایسی عظیم الشان جماعت تیار کر لی تھی، جس نے اپنی جہادی سرگرمیوں سے قرون اولی کے غازیوں کی یاد تازہ کر دی۔ ایسے ہی مجاہدوں کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

ان کے اخلاص و للہیت، ایثار و قربانی اور زہد و تقویٰ میں کلام نہیں، مگر وہ کیا پہلو تھے، جو تحریک جہاد کی پیش رفت میں سید شہید کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ ان کا ادراک نہ کر سکے؟ مہر صاحب نے سید شہید کی بشری کمزوریوں کی مدلل تاویل و توجیہ کی ہے۔ [سید سلیمان کے ایک اور لائق شاگرد] مسعود عالم ندوی نے اپنی تالیف ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک (۱۹۴۶ء) میں مجاہدین کی ناتجربہ کاری، ان کے تسامحات اور فروگذاشتوں [۱۱۵] کا ذکر کیا تو مہر صاحب کا عقیدت مندانہ ذہن معترض ہوا کہ ایسے الفاظ کا

استعمال مناسب نہیں۔

زیر نظر سوانح عمری سے پتا چلتا ہے کہ تحریک مجاہدین میں ایک حد تک تنظیم اور منصوبہ بندی کی کمی تھی، جماعت مجاہدین کی کماحقہ، ذہنی تربیت نہ ہو سکی تھی اور مجاہدین کے زیر انتظام علاقوں میں باقاعدہ کوئی نظم قائم نہیں کیا گیا۔ بعض اقدامات صریحاً حکمت و دانش سے بعید معلوم ہوتے ہیں۔ مہر صاحب ان سب باتوں کا تجزیہ نہیں کر سکے مگر اس کمزور پہلو کے باوجود، بہ طور سوانح عمری یہ بہت اعلیٰ درجے کی کاوش ہے۔ مہر صاحب کثیر التصانیف قلم کار تھے، لیکن وہ سیرت سید احمد شہید کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تو یہ ایک کتاب ہی، بہ طور سوانح نگار، انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔

غلام رسول مہر کے ذکر سے ان کی ایک اور کاوش سوانح عمری جنرل سر عمر حیات ٹوانہ (۱۹۶۵ء) یاد آگئی۔ قلم کی مزدوری انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ کیسی عبرت ناک بات ہے کہ سیرت شہید" کے مولف کو، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے دست و بازو اور ہر سطح پر فرنگیوں کے معین و معاون عمر حیات ٹوانہ کی سوانح بھی لکھنا پڑی۔ انگریزوں سے ممدوح کی اعانت کے احوال و واقعات تو مولف نے ایک سچے راوی کی طرح بیان کر دیے، مگر ان کے عیب و صواب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مجموعی طور پر کتاب میں ممدوح کی شخصی اوصاف اور حسن اخلاق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ موصوف کے "کارناموں" نے ملی و اجتماعی زندگی کو کس انداز میں متاثر کیا؟ اس باب میں مہر صاحب مُہرِبلب ہیں۔ ظاہر ہے ایک فرمایشی بایوگرافی میں منطق و مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

ایک اور فرمایشی سوانح، مہر صاحب کے رفیق عبدالمجید سالک کو بھی لکھنی پڑی۔ ان کی مجبوری مہر کی سی نہ تھی۔ ان کا موضوع اعلیٰ درجے کا تھا۔ علامہ محمد اقبال سے سالک کو سالہا سال تک صحبت و مخاطبت کا شرف میسر رہا، مگر افسوس ہے کہ سالک صاحب اپنی صحافیانہ افتاد طبع سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکرِ اقبال (۱۹۵۵ء) سے شاعر مشرق کی شخصیت کا بھرپور نقش نہیں بنتا۔ سوانح نگار کو غلام رسول مہر اور عبداللہ چغتائی کا جمع کردہ بہت سا لوازمہ میسر تھا (ص ۴)۔ انھوں نے بعض پرانے اخبارات سے بھی مدد لی مگر وہ ایسے مصنفین میں سے نہ تھے جو علمی لگن اور ولولے سے سرشار ہو کر، اپنی تحقیق کے

حتمی نتائج کے لیے عرق ریزی و پِتّا ماری کو ناگزیر سمجھتے ہوں۔ بہت سی واقعاتی غلطیوں کے علاوہ ذکرِ اقبال میں سالک کے ذاتی معتقدات (مثلاً: قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ' یونی نسٹوں سے ہمدردی وغیرہ) کی جھلک نمایاں ہے۔ تحقیق و استناد کی کوتاہی و کمی سے یہ بایوگرافی' اقبال جیسی شخصیت کے شایانِ شان نہ بن سکی۔ کاش اقبال کی سوانح سالک کے بجائے مہر ہی سے لکھوائی جاتی۔ [۱۲]

دوسری بار سالکؔ مرحوم ہی کے خلف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے سوانحِ اقبال کی فرمایش کی گئی۔ سرگزشتِ اقبال (۱۹۷۷ء) نسبتاً جامع اور مفصل ہے' مگر مصنف کی مشکل یہ ہے کہ وہ بھی عمر بھر آبائی پیشے یعنی صحافت اور اس کی تدریس سے وابستہ رہے۔ دوسرے انھیں یہ کام ایک محدود وقت میں اور بہ عجلت انجام دینا پڑا۔ چنانچہ اس بایوگرافی کے بعض حصوں کی مناسب طریقے سے تدوین نہ ہو سکی۔ بعض امور تشنۂ تحقیق رہ گئے۔ اس میں سیاست دان اقبال' شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر حاوی نظر آتا ہے۔ قاری کو ممدوح کی داخلی دنیا میں اٹھنے والے ہنگاموں اور کرب و اضطراب کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ سوانح نگار نے بہت کچھ اپنے والد ماجد پر بھروسا کیا ہے۔ اس کا ظاہری ڈھانچا بھی ذکرِ اقبال پر استوار ہے۔

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ جشنِ ولادت اقبال ہی کی فرمایش پر' اقبال کے ایک دیرینہ رفیق، سید نذیر نیازی نے بھی دانائے راز (۱۹۷۹ء) تالیف کی۔ ابتدائی حصے میں مصنف نے حیاتِ اقبال کے تشکیلی دور پر مربوط انداز میں نظر ڈالی ہے جس سے اقبال کا ذہن اور شاعرانہ ارتقا واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اقبال کی عائلی زندگی اور کبوتروں سے ان کی غیر معمولی دلچسپی پر بھی اچھی بحث کی گئی ہے مگر کتاب کے بعض حصے غیر ضروری طور پر طویل ہیں۔ فصل دوم میں ربط و جامعیت اور اِستنباطِ نتائج کی وہ صورت مفقود ہے' جو فصل اول میں نظر آتی ہے۔ کتاب کی مناسب تدوین نہیں کی گئی۔ نذیر نیازی خود بھی اپنے اس کام سے مطمئن نہ تھے' مگر ان جیسے بزرگ سے جو کچھ میسر آیا' وہ بھی بسا غنیمت ہے۔

اقبال صدی (۱۹۷۷ء) کے زمانے میں بعض مختصر سوانح عمریاں شائع ہوئیں: حیاتِ

اقبال (ایم ایس ناز) یاد اقبال (صابر کلوروی) محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات (جگن ناتھ آزاد)۔

محمد حنیف شاہد نے مفکرِ پاکستان (۱۹۸۲ء) کو پہلی بار "مستند ترین اور بالکل صحیح ماخذوں" کے ساتھ پیش کرنے کا دعوی کیا۔ کتاب کی ترتیب میں دو رنگی یا دو عملی واضح طور پر نظر آتی ہے، مگر مصنف کی محنت و لگن، کاوش و جستجو اور لوازمے و مسالے کی فراہمی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ مصنف نے ترتیب سوانح میں انجمن حمایت اسلام کی رودادوں اور پنجاب گزٹ سے پہلی بار مدد لی ہے۔ اس اعتبار سے مفکر پاکستان ایک پُر از معلومات اور ضخیم سوانح عمری ہے (۷۲۰ صفحات)۔ مگر سوانح عمری محض معلومات و کوائف اور اقتباسات کو جمع کر دینے کا نام نہیں ہے۔ مصنف کے ہاں نظم و ضبط اور ترتیب و تسوید کا نقص بہت نمایاں ہے۔ اسی طرح تحلیل و تجزیے، نقد و انتقاد اور اخذِ نتائج سے بالعموم گریز کیا گیا ہے۔ غیر محتاط اِدّعائی لہجے اور تدبّر کے فقدان نے بھی کتاب کے اِستناد و ثقاہت کو مجروح کیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رود (۱۹۷۹ء-۱۹۸۱ء- ۱۹۸۴ء) تاحال، اقبال کی سب سے تفصیلی اور جامع سوانح عمری ہے۔ ان کے لیے ایک آسانی یہ تھی کہ حیات اقبال سے متعلق بعض بنیادی مآخذ براہ راست (اور صرف) ان کی دسترس میں تھے۔ اور مشکل یہ تھی کہ نسبی تعلق کے سبب، ان کے لیے کلی طور پر معروضیت پر کاربند رہنا آسان نہ تھا۔ اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک سوانح نگار کی ذمہ داریوں سے انحراف نہیں کیا اور حیات اقبال کے بعض وضاحت طلب امور کی پردہ پوشی کے بجاے انھوں نے بڑے متوازن انداز میں نازک مسائل کو چھوا ہے، مثلاً: ازدواجی زندگی کا بحران، نہایت اہم بحث ہے۔ جاوید اقبال نے عطیہ فیضی کے موقف کو رد کر دیا ہے کہ عائلی زندگی کی تلخیوں نے اقبال کی صلاحیتوں کو گھن لگا دیا تھا، اور ان کی ذہانت و طباعی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ سوانح نگار کو عطیہ کی راے سے بھی اتفاق نہیں کہ اقبال اضطراب کے اس مرحلے سے نہ گزرتے تو بہت کچھ بن سکتے تھے۔ وہ (بالکل بجا) کہتے ہیں کہ اقبال خواہ اس مرحلے سے گزرتے یا نہ گزرتے، بننا انھوں نے وہی کچھ تھا، جو بالآخر بنے۔ اسی طرح سوانح نگار نے

اقبال پر بعض دیگر الزامات (مثلاً: شراب نوشی' طوائف کا قتل وغیرہ) کا بھی کامیاب تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کی بحث' دلیل اور منطق پر مبنی ہے' اس لیے قائل کرتی ہے۔ زندہ رود کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ علامہ کی زندگی' ایک بڑے انسان (great man) کی پُرعظمت زندگی تھی۔ ایک بار انھوں نے اپنی ذہنی اور دماغی سرگذشت لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی (جو وہ نہ لکھ سکے' مگر اب) ان کی تمنا' ایک حد تک' زندہ رود کی صورت میں بروئے کار آئی ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی عروج اقبال (۱۹۸۷ء) معروف معنوں میں علامہ کی سوانح عمری نہیں' مگر اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس میں ۱۹۰۸ء تک کے ضروری سوانحی کوائف کے ساتھ اقبال کی ذہنی تشکیل کے عوامل کا نہایت بالغ نظری سے سراغ لگایا گیا ہے۔ صدیقی صاحب نے عام سوانح نگاروں کے برعکس شخصیت' شاعری اور فکر کی اکائی کو نمایاں کیا ہے۔ ''اقبال اور جستجوے گل'' میں عطیہ فیضی کے مبالغہ آمیز بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ عطیہ ایک خود پسند' سطح بین اور نمایش اور تفریحی مشاغل کی دل دادہ خاتون تھیں۔ وہ اقبال سے پرستارانہ نیاز مندی کی توقع رکھتی تھیں لیکن جب اقبال جیسے خوددار شخص سے نیاز مندانہ خراج تحسین حاصل کرنے میں ناکام رہیں' تو اقبال کو خود پرستانہ کلبیّت (cynicism) کا شکار قرار دیا۔ ان کے نزدیک عطیہ کے بیانات' اس کے شکست پندار کی دلیل اور اس کی سطحی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ اقبال کی ہشت پہلو شخصیت کو سمجھنے کے لیے عروجِ اقبال کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سیرت النبیؐ اُردو بایوگرافی کا سب سے بڑا موضوع رہا ہے۔ کسی اور شخصیت پر یقیناً اتنی تعداد میں کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اس مختصر جائزے میں سب کا ذکر مشکل ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتمؐ اپنے اسلوب کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ نعیم صدیقی نے محسنِ انسانیتؐ (۱۹۶۰ء) میں آنحضورؐ کی انقلابی شخصیت اور داعیانہ کردار کو نمایاں کیا ہے۔ ادبی اسلوب میں سیرت نبیؐ پر یہ ایک ولولہ انگیز کتاب ہے۔

پاکستان کے قومی اور ملی ہیروؤں پر بہت سی سوانح عمریاں چھپیں' ان سب کا ذکر یہاں

ممکن نہیں، البتہ عزیز بھٹی شہید (اصغر علی گھرال، ۱۹۶۷ء) اور فاتح (ہارون الرشید، ۱۹۹۰ء) اپنے غیر روایتی انداز اور تازگی و طرفگی کے سبب نسبتاً اہم ہیں۔ دونوں سوانح عمریوں میں ممدوحین کے بارے میں خاصی تحقیق و تفتیش کے بعد، بعض پہلوؤں سے جزئیات تک فراہم کی گئی ہیں، جن سے ممدوحین کی زندگیوں کے قابل رشک نقوش سامنے آتے ہیں۔ تصاویر اور بعض دستاویزات نے مذکورہ سوانح عمریوں کو زیادہ مستند اور دل چسپ بنا دیا ہے۔ ان سے تاریخ پاکستان کے خاص ادوار اور ان کا پس منظر بھی روشن ہوتا ہے۔ عزیز بھٹی کی شخصیت ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کی شخصیت، افغان جنگ (اور اس دور کے پاکستان) کے پیش منظر میں سامنے آتی ہے۔ عزیز بھٹی شہید کے بین السطور، موضوع کے ساتھ مؤلف کی ایک ذاتی لگن اور ایک ولولہ صاف نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس میں ایک منظم و مرتب سوانح عمری کا ربط ذرا کم نظر آتا ہے، اس کے باوجود اس کی دل کشی و دل چسپی میں کلام نہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے اسے "اُردو کے سوانحی ادب میں ایک اضافہ" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اُردو کی بہت کم سوانح عمریوں کو اس حد تک مکمل کہا جا سکتا ہے کہ ان کا موضوع ایک ایسے جیتے جاگتے، سانس لیتے کردار کی صورت میں ہمارے قریب آ جائے کہ ہم اس کے دل کی دھڑکن بھی سن سکیں، اور جذبے کی گرمی بھی محسوس کر سکیں"۔ (پیش لفظ)

فاتح کے انداز و اسلوب پر مغربی سوانح نگاروں کا اثر ہے، لیکن صرف یہی چیز کتاب کو ایک جداگانہ قسم کی سوانح عمری نہیں بناتی، اس میں ہارون الرشید کے مزاج، ان کی صحافتی و ادبی تربیت، مطالعے اور ان کے قلم کو بھی دخل ہے۔ وہ کفایتِ لفظی کا ہنر جانتے ہیں اور طرفگی سے بات کرنے کا سلیقہ بھی۔ البتہ محنت و کاوش سے اور تلاش و تحقیق کے بعد تیار کردہ اس سوانح عمری کے آخری حصے میں فاتح سے زیادہ، اس کا ماحول اور پس منظر و پیش منظر زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ دونوں کتابیں، پُرتاثیر سوانح عمریوں میں شمار ہوں گی۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا: اُردو میں سوانح عمری کی عمر، کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، مگر اس مختصر مدت میں بھی، اُردو کے نثری ادب میں سوانح عمریوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ

وجود میں آچکا ہے، جس میں ہر نوع اور ہر معیار کی سوانح ملتی ہیں۔ ایک مختصر سے مضمون میں ان سب کا تنقیدی جائزہ تو کجا، انھیں گنانا بھی آسان نہیں ہے۔ ہم نے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر، معدودے چند سوانح عمریوں کا ذکر کیا ہے۔

۲

ایک اچھی سوانح عمری کی کوئی تعریف (definition) متعین نہیں کی جا سکتی، مگر یہ ضرور ہے کہ وہ، صاحب سوانح کی حیات و شخصیت، خدمات اور کارناموں کے بارے میں ہماری معلومات میں اس طور اضافہ کرتی ہے کہ ہمارے ذہن مسرت و بصیرت سے اور قلب، نور و حرارت سے روشن ہوتے ہیں۔ اُردو سوانح عمری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سوانح عمری کسی مخصوص ڈھب، مقررہ اسلوب یا کسی متعین نمونے پر نہیں لکھی گئی۔ زمانے اور ماحول کے مقتضیات، سوانح نگار کی ذہنی افتاد اور ممدوح سے اس کے تعلق کی نوعیت سے سوانح عمری کی نہج تبدیل ہوتی رہی ہے۔ پھر تجارتی ضرورتیں، حاکمانہ فرمایشیں، تبلیغی فرائض اور ممدوحین سے عقیدت مندی بھی سوانح نگاری کا محرک رہے ہیں۔ سو برس پہلے حالی نے بزرگوں کے کمالات اور عمدہ کارناموں کا رشتہ سوانح عمری سے جوڑتے ہوئے کہا تھا: "بیوگریفی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے"۔ پھر انگلستان کے ایک مصنف کا قول نقل کیا تھا کہ: "بیوگریفی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو"۔ [۱۳] اور آج ایک صدی بعد بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اکابر کی زندگیوں کے قابل قدر اور مثالی نمونے، سربلندی اور ترقی کا راستہ دکھا کر، قوم کی تقدیر پلٹ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر سوانح کا اصل مقصد سبق آموزی اور عبرت انگیزی ہے۔ بیش تر اُردو سوانح عمریوں کا یہی محرک بھی ہے اور مقصود بھی۔ یہ چیز ہم مسلمانوں ہی میں نہیں، پورے مشرق کے خمیر میں شامل ہے۔

چند برس پہلے، بھارت سے شبید جستجو (۱۹۸۸ء) کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی سوانح عمری شائع ہوئی ہے۔ یہ نسبتاً ایک تازہ (latest) سوانح عمری ہے۔ اس

کے مؤلف ضیاء الحسن فاروقی، اس سوال پر گفتگو کرتے ہوئے کہ انھوں نے یہ بایوگرافی کیوں لکھی؟--- اپنے اس احساس کا ذکر کرتے ہیں کہ اس طرح "نئی نسل کو، خاص طور پر مسلمانوں کی نئی نسل کو، ان اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں سے روشناس" کرانے کا موقع پیدا ہو گا، مزید یہ کہ: "میں نے سوچا کہ خلوص و خدمت اور علم و عمل کے اس پیکر مجسم کی زندگانی سے شاید نئی نسل کو "نئی نگاہ" مل جائے کہ اس کی، آج کے حالات کے اندھیروں میں سخت ضرورت ہے"۔ سوانح عمری کا یہ وہی افادی تصور ہے جو سو سال پہلے حالی نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا: "ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹی کل طریقے سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں، اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی دکھائی جائیں"۔ [۱۴] یہ بات بڑی حد تک، آج بھی ویسے ہی صحیح ہے، جیسے سو برس پہلے تھی۔ کریٹی کل بایوگرافی لکھنے کا وقت اب بھی نہیں آیا [اور شاید کبھی نہیں آئے گا]۔ ہم مسلمان کسی شخص کی کوتاہیوں کا ذکر غیبت کے مترادف سمجھتے ہیں، اور خُذْ ما صَفٰی وَدَع ما کَدَرْ کے قائل ہیں۔ مشرق میں سوانح نگار، کسی شخصیت پر قلم اٹھاتا ہے تو بالعموم اسے ہیرو سمجھ کر، اور ہیرو، ہمارے ہاں قصہ و داستان کی روایت میں، دنیا جہان کی خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

۳

ہمارے نقاد، سوانح نگاروں سے معروضیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ مطالبہ بجا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ معروضیت یا غیر جانب داری کیا ہے؟ اور کیا کسی سوانح نگار کے لیے پوری طرح معروضی ہونا ممکن ہے؟ ہمارے ہاں معروضیت کا شاخسانہ زیادہ تر مغربی اثرات کے تحت پیدا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مشرق، روایت پرست، وضع دار اور ایک دوسرے کا لحاظ کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے مغربیوں کی سی بے نیازی، بدلحاظی اور بے مروتی اختیار کرنا ممکن نہیں، لہٰذا ان سے مغربی انداز کی معروضیت کا مطالبہ کچھ بے جا سا ہے، اور اس کی پذیرائی کے امکانات کم سے کم تر ہیں۔ ایک دل چسپ سوال یہ ہے کہ حیات جاوید کو "کتابُ المناقب" اور "مدلّل مدّاحی" کہنے والے مولانا شبلی کیا اپنی

تصانیف میں معروضیت برقرار رکھ سکے؟ اس ضمن میں ان کے ایک مداح مہدی افادی کی رائے دیکھیے، وہ لکھتے ہیں:

"بہ لحاظ فن، حالی کے جس اقتصار کی طرف، نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں، اس کا جواب، مجھے خوف ہے، غیر امید افزا ہو گا"۔[۱۵]

اسی ضمن میں کچھ مثالیں دیتے ہوئے، وہ مزید لکھتے ہیں:

"شبلی نے الکلام لکھی، لیکن اس میں سرسید کا نام تک نہ آیا، حالاں کہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی، اور یہ امر بلااختلاف، ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے"۔[۱۶]

مہدی کا یہ شکوہ بجا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ ہر شخص ایک مخصوص مزاج اور ذہنی سانچے کے ساتھ مسائل و معاملات کو دیکھتا اور خاص نہج پر سوچتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال بڑی حد تک اس کے شخصی زاویۂ نظر اور ذاتی پسند و ناپسند سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک لکھنے والے کی تحریر میں غیر شعوری طور پر نسلی، قومی اور علاقائی اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ مشرق میں عموماً اور مسلمانوں کے ہاں خاص طور پر، زندگی میں عقیدے کی موثر کارفرمائی مسلم ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات، اس کے ماننے والوں کا ذہن ہی تبدیل نہیں کرتے، پوری طرح اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ معروضیت کی بحث میں کیا ان چیزوں سے ماورا ہونا ممکن ہے؟ لیکن میں اس بات کا بھی قائل نہیں کہ ہم معروضیت کی شرط کو بالکل اڑا دیں۔ دراصل سوانح نگار سے غیر جانب داری یا معروضیت کے بجاے اعتدال و توازن اور انصاف پسندی کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر لکھنے والا صدق و راستی اور حق و انصاف کا علم بردار بن جائے تو اس کی تحریر از خود معروضی ہو جائے گی۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے، جہاں محض اپنے قیاسات و مزعومات کی بنا پر حق و باطل میں آمیزش کی جاتی ہے۔ کسی ممدوح یا ہیرو کی کوئی خامی یا کمی کوتاہی، اس کی شخصیت یا فطرت کا حصہ ہوتی ہے، اور اس لیے ایک برحق صداقت، حقیقت یا سچائی

ہے۔ اسے معرض تحریر میں لانا' اس کا اظہار کرنا ایک طرح سے اس کی گواہی یا شہادت ہے اور ہمیں تو وَلاَ تَکتُمُوا الشَّهَادَة [۱۷] کی تلقین کی گئی ہے اور کِتمانِ حق سے منع کیا گیا ہے' مگر یہ خیال رہے کہ سوانح نگاری کا ایک بنیادی وصف ہمدردی و احترام کا جذبہ ہے۔ فی الحقیقت ہمدردی و احترام' تقاضاے انسانیت و آدمیت ہے' اس لیے اس کے بغیر انصاف ممکن ہے' نہ ہیرو کی نفسیات کو سمجھنا آسان ہے۔ شیخ محمد اکرام کو بھی آخرکار قائل ہونا پڑا کہ صحیح سیرت نگاری کے لیے' صاحب سیرت کا "ہمدردانہ مطالعہ" ضروری ہے۔ [۱۸] بہ ہرصورت' سوانح نگار ہمدردی و احترام کے ساتھ ممدوح کی خامیوں کا ذکر کرے گا تو فی الحقیقت اس کی بشریت ہی نمایاں ہو گی' اور کسی ممدوح کے لیے بشر ہونا' باعث فخر و امتیاز ہے' نہ کہ فرشتہ ہونا۔

۴

معروضیت کے مسئلے سے قطع نظر کیجیے' تب کیا اُردو سوانح عمری کا معیار اطمینان بخش ہے؟ میرے خیال میں ہرگز نہیں۔ اچھی' عمدہ اور فنی اعتبار سے معیاری سوانح عمریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے: "باوجود کڑی تنقیدی نظر کے' ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو کیا چیز ہے' جو اُردو سوانح نگاری میں موجود نہیں ہے"۔ [۱۹] پھر انھوں نے اُردو میں بعض سوانحی سلسلوں اور کتابوں کے نام گنوانے کے بعد قرار دیا ہے کہ یہ سب کچھ "اُردو سوانح نگاری کی سربلندی کے لیے کافی" ہے۔ [۲۰] مگر ہمیں فاضل محقق کی راے سے اتفاق نہیں ہے۔

معاصر سوانحی عمریوں پر نظر ڈالی جائے تو (اِلّا ماشاء اللہ) کیا واقعی ایسا ہے؟ "اس کا جواب [ہمیں] خوف ہے' غیر امید افزا ہو گا"۔

بیش تر سوانح عمریوں میں اس صنف کے فنی اور تکنیکی تقاضوں سے غفلت برتی گئی ہے۔ ہمارے سوانح نگاروں کو ابھی یہ سیکھنا باقی ہے کہ لوازمے کی چھان پھٹک کیسے کی جائے' کھرے کو کھوٹے سے الگ کیسے کیا جائے اور اہم کو غیر اہم سے انتخاب کر کے اسے حسن و سلیقے سے کیسے مرتب کیا جائے۔ معمار کے لیے یہ دیکھنا ناگزیر ہوتا ہے کہ کون سی

اینٹ کہاں اور کس زاویے سے لگائی جائے گی۔ سوانح نگاری میں حالی کی خامیاں بجا' مگر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ: "حالی نے مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے"۔[۲۱] آج اتنی قابلیت بھی ہمیں کتنے سوانح نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے؟ بیش تر سوانح عمریاں غیر متعلق مواد' اور طویل اقتباسات کے بے ڈھب ملغوبے پر مشتمل ہیں۔ ہمارے خیال میں اُردو سوانح عمری کو ایک اطمینان بخش معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔

سوانح نگاری تاحال ایک مستحکم اور جان دار علمی روایت نہیں بن سکی۔ اس کی ایک وجہ تو محنت اور پتا ماری کی کمی ہے' دوسرے ہمارے ہاں مواد اور لوازمے کی دستیابی میں مشکلات حائل ہیں۔ جرمنی کے بعض کتب خانوں اور اداروں کو دیکھ بھال کر آنے والے ایک دوست نے بتایا کہ وہاں کسی شعبہ حیات کا کوئی اہم شخص فوت ہو جاتا ہے' تو اس کے پس ماندگان گھر میں موجود اس کے تمام کاغذات' ڈائریاں' مسودات اور یادداشتیں وغیرہ ازخود جمع کر کے کسی قومی کتب خانے کو دے دیتے ہیں۔ کتب خانے میں ان کی چھان پھٹک کے بعد' انھیں رجسٹروں اور فائلوں میں ترتیب دے کر' فہرست بنا کر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور یہ وہاں کی دیرینہ اور مستقل روایت ہے۔

فی الحقیقت علمی تحقیق میں بھی ہمیں مغرب سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنا مزاج تو نہیں بدل سکتے اور اپنی شناخت تو نہیں کھو سکتے' مگر کسی فن میں مغربیوں کے سالہا سال کے تجربات' اور اُن سے حاصل ہونے والے شعور اور مہارت سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے۔

(سہ ماہی **صحیفہ** لاہور' اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء' نظرثانی: جون ۱۹۹۹ء)

حوالے اور حواشی

۱۔ ڈاکٹر سید شاہ علی: **اردو میں سوانح نگاری**' گلڈ پبلشنگ ہاؤس' کراچی' ۱۹۶۱ء' ص ۷۵۔

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: **وجہی سے عبدالحق تک**' مکتبہ خیابان ادب لاہور' ۱۹۷۷ء' ص ۱۲۶۔

۳۔ حالی: **حیات جاوید**' ترقی اُردو بیورو' دہلی' ۱۹۸۲ء' ص ۲۴' ۲۵۔

۴۔ حوالہ ۳، ص ۲۴۔

۵۔ حوالہ ۱، ص ۱۹۱۔

۶۔ گیان چند: کھوج، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۲۔

۷۔ حوالہ ۱، ص ۲۸۹۔

۸۔ حوالہ ۲، ص ۱۵۷۔

۹۔ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ سید سلیمان کے ہاں سوانح نویسی میں، ممدوح سے عقیدت مندی کا بڑھتا ہوا رجحان، ایک لحاظ سے، ان کی خانقاہ اشرفیہ سے وابستگی کا شاخسانہ ہے۔ (یادگار شبلی، ص ۱۳)۔ راقم کے خیال میں یہ بات خاصی حد تک درست ہے۔ آگے چل کر دینی اکابر کی سوانح عمریوں میں ممدوحین سے غیر معمولی عقیدت اور ان کی فروگذاشتوں کے ذکر سے اجتناب کا رجحان بہت نمایاں ہوا جیسے: **سوانح قاسمی**، از مناظر احسن گیلانی یا **سوانح مولانا محمد زکریا**، اور **سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری** از ابوالحسن علی ندوی یا **مہر منیر** از مولانا فیض احمد وغیرہ۔

۱۰۔ ابوالحسن علی ندوی کے دوست مسعود عالم ندوی نے **سیرت سید احمد شہید** کے حوالے سے شکوہ کرتے ہوئے لکھا: "افسوس ہے کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریق نظر و فکر خالص عقیدت مندانہ ہے، اور انھوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے"۔ (**ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک**، دارالاشاعت نشات ثانیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۱۱)

۱۱۔ دیکھیے: حوالہ ۱۰، ص ۱۱

۱۲۔ **بزم اقبال [لاہور] کی رودادیں** (بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی ۵، ۶ سو صفحات کی سوانح عمری لکھنے کا کام بارہ ہزار روپے کے معاوضے پر مہر صاحب کو سونپا گیا تھا (ص ۱۰۷)۔ پھر معلوم نہیں کیوں، مہر صاحب کی پیش کردہ بعض شرائط نامنظور کرتے ہوئے یہ معاملہ ختم کر دیا گیا (ص ۱۱۹) اور تین ہفتے بعد عبدالمجید سالک کو، ساڑھے تین ہزار روپے "نذرانے" کی پیش کش پر، ۲۵۰ صفحات کی سوانح عمری لکھنے کا کام سونپ دیا گیا اور وہ لوازمہ بھی ان کے سپرد کر دیا گیا، جو مہر صاحب اور چغتائی صاحب نے جمع کیا تھا۔ (ص ۱۲۲۔ ۱۲۳)

۱۳۔ حیات سعدی (مرتبہ: رشید حسن خاں) مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۔

۱۴۔ حوالہ ۳، ص ۲۴۔

۱۵۔ مہدی حسن: افادات مہدی، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۳۱۶۔

۱۶۔ حوالہ ۱۴، ص ۳۱۷۔

۱۷۔ ترجمہ: شہادت کو نہ چھپاؤ (البقرہ: ۲۸۳)۔

۱۸۔ یادگار شبلی: ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۶۔

۱۹۔ حوالہ ۱، ص ۳۱۱۔

۲۰۔ حوالہ ۱۹۔

۲۱۔ آل احمد سرور: تنقیدی اشارے، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۹۴۔

اردو میں اندلس کے سفرنامے

بالِ جبریل کی ایک غزل کا مصرع ہے:

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

اردو میں اندلس کے سفرنامے، بڑی حد تک ایسی ہی منزل کی دیدوادید اور دریافت و بازیافت، اور اس حوالے سے اندلسی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی حسرت آمیز تاریخی تفصیلات سے عبارت ہیں۔ اندلسی جنت گم گشتہ سے محرومی، دوران سیاحت، اندلس کے ہر مسلمان سیاح کے سینے کی پھانس بنی رہتی ہے۔ وہ جب بھی قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ اور مالقہ کے درمیان، اندلس کے سرسبز و شاداب اور نیم سطح مرتفع علاقوں میں سفر کرتا ہے اور کھجوروں کے جھنڈ، زیتون کے باغات اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر واقع عربوں کے نیم شکستہ قلعوں اور کلیساؤں کے سرکشیدہ ٹاور دیکھتا ہے تو قدرتی طور پر اس کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے (اور بجا طور پر) کہ یہ ٹاور کبھی مسجدوں کے مینار تھے، جن سے صدائے تکبیر بلند ہوتی تھی مگر اب ان کے اوپر صلیبیں نصب ہیں اور ان کے اندر گھنٹیاں بجتی ہیں۔

سپین، نہ صرف جغرافیائی، بلکہ مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے یورپ کا حصہ ہے مگر اندلس کے سیاحوں کا مشاہداتی زاویہ، مسافرانِ لندن و پیرس کے سیاحوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے اندلس کے سفرنامے، بھی یورپی ممالک کے سفرناموں سے مختلف نوعیت کے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے سفر میں، سیاح کا مشاہدہ بالعموم متعلقہ ملک کے جغرافیے اور خارج کے مناظر تک محدود رہتا ہے مگر اندلس کا مسافر شدت سے محسوس کرتا ہے کہ جغرافیے کے مشاہدے کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ اس کی مشاہداتی و مطالعاتی نظر میں، سرزمین اندلس سے محبت و عقیدت اور ایک جذباتی تعلق

کے علاوہ، اس خوب صورت وطن سے محرومی اور اس پر تاسف کا احساس بھی شامل ہوتا ہے چنانچہ زائر اندلس بہ یک وقت دو دنیاؤں میں سفر کرتا ہے۔ اس کی نظر، ہسپانیہ کے قدرتی مناظر پر ہوتی ہے مگر دل و دماغ ماضی کے پُرشکوہ اور منقش ایوانوں میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ خبر و نظر اور دیدہ و دل کے اس سفر میں جہانِ اندلس کا چپا چپا، اسے "ہر جا جہانِ دیگر" کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔

۲

اردو میں اندلس کے نو باقاعدہ سفرنامے ملتے ہیں۔ چند سیاحتی مضامین اور مشاہداتی رودادیں بھی لکھی گئی ہیں۔ آیئے، ان پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

نواب محمد عمر علی خاں کا سفرنامہ اندلس مسمّٰی بہ: قندِ مغربی (۱۸۹۸) [۱] "معیار کے اعتبار سے کوئی وقیع سفرنامہ نہیں ہے، اس کے باوجود اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے"۔ [۲] یہ ہسپانیہ کا قدیم ترین معلوم و دستیاب اردو سفرنامہ ہے۔ اور وہ بھی جزوی، کیوں کہ کتاب کا بہ مشکل ایک تہائی حصہ سپین سے متعلق ہے۔ نواب محمد عمر قبل ازیں اپنی سیاحتوں کی روداد پر مشتمل سات کتابیں شائع کر چکے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے بارسیلونا، ویلنسیا، قرطبہ، غرناطہ، مالقہ اور میڈرڈ کی زیارت کی۔ ان کی زیادہ توجہ تاریخی احوال و واقعات کے بیان پر رہی ہے۔ سفر کے حالات و مشاہدات کا بیان نسبتاً مختصر ہے۔ اس میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور ان کی ہمہ پہلو ترقی، خصوصاً تعمیرات کے فنی کمالات پر استعجاب کا پہلو نمایاں ہے۔ ہر سیاح کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے زوال پر رنجیدہ و متاسّف نظر آتے ہیں۔

نواب محمد عمر علی خاں نے، بہ قول ڈاکٹر انور سدید: "مسلمانوں کے دور زریں میں سفر کرنے کی سعی کی اور مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کے جلال و جبروت کو بڑی خوبی سے اہل ہند پر آشکار کیا"۔ [۳] آگے چل کر، اندلس کے مختلف سفرناموں میں یہی رجحانات واضح صورت میں نکھر کر سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ قند مغربی نہ صرف اردو کے ابتدائی سفرناموں بلکہ خود مصنف کے دیگر سفرناموں میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔

قاضی ولی محمد کے سفرنامہ اندلس (۱۹۲۷ء)[۴۳] میں تین رنگوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی بنیادی حیثیت مورخ اور محقق کی ہے اور وہ بڑی کاوش سے مسلم عہد کی تاریخ اندلس کا ورق ورق یک جا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس عمل میں انھوں نے حال سے مدد لی اور حال کا مشاہدہ، ماضی کی روشنی میں کرتے ہوئے: "ہر شہر کے شکستہ و ریختہ آثار اسلامی کا ہلکا سا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے"۔ (ص ۲) ان کے جمع کردہ تاریخی حقائق اور جغرافیائی اعداد و شمار، مفید ذخیرۂ معلومات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہ طور مورخ، وہ نہایت ذوق و شوق سے عرب اور بربر شہ سواروں کی شجاعت د شمشیر زنی اور اس کے نتیجے میں فتوحات کے سیل بے پناہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں قاضی ولی محمد کا انداز محققانہ ہے۔

سرزمین ہسپانیہ پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین اولین معرکہ آرائی کے تذکرے میں ایک سوال ان کے سامنے آتا ہے کہ طارق اور لذریق کے درمیان جنگ کس مقام پر لڑی گئی؟ اور اب وہ مقام کس حالت میں ہے؟ لکھتے ہیں:

"میں جھیل کے قریب ایک ٹیکرے پر چڑھ کر دیر تک موقع جنگ کا اندازہ لگاتا رہا کہ شجاعان اسلام اس ٹیکرے پر کس جگہ مورچہ بند ہوئے تھے اور کس جگہ طارق نے معرکہ آرا تقریر کی تھی، لذریق کا رتھ کس مقام پر تھا اور یلیان و ارطباش و المند کی سپاہ کہاں صف بستہ تھی"؟ (ص ۴۳)

قاضی ولی محمد کا دوسرا روپ ایک خوش باش سیاح کا ہے۔ وہ مورّخانہ تلاش و تحقیق کے ساتھ ہسپانوی معاشرے کے رنگین و خوش رنگ پہلوؤں سے بھی واقف اور لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ اِشبیلیہ پہنچتے ہی انھوں نے ہوٹل میں سامان رکھا، جلدی سے کھانا کھایا اور ایک قہوہ خانے میں "مشرقی رقص و سرود کی مجلس دیکھنے چل" دیے۔ یہ ان کے لیے بالکل ایک نیا تماشا تھا، ناچ گانا دیکھ کر محظوظ ہوئے اور عالم بے خودی میں ساڑھے گیارہ بجے شب قیام گاہ پر واپس آئے۔ (ص ۴۸-۴۹)

مگر اس تفریحی عمل میں: "تھیٹر، باغات، محلات، بازارات، میلہ، مناظر" کے درمیان سے گزرتے اور لطف اندوز ہوتے ہوئے، قاضی ولی محمد کا راستہ: "ہمیشہ پرانے کھنڈرات

کی طرف" جا نکلتا ہے۔ (ص ۲) وہ کھوئے ہوئے اندلس کے غم میں سوگوار ہو جاتے ہیں:

"زمین وہی ہے جو مسلمانوں کے وقت میں تھی۔ وہی دریا' وہی پہاڑ' وہی آسمان' وہی موسم' لیکن مسلم گل چیں کی غیر موجودگی سے تمام گلزار اندلس اجڑ گیا ہے"۔ (ص ۷)

کبھی "مسلمانوں کی داستان خوں چکاں" بیان کرتے ہوئے آنسو بہانے لگتے ہیں۔ اس سرزمین سے کچھ ایسا تقدس وابستہ ہے کہ گویا: "مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں"۔ قاضی صاحب ریل کے لمبے سفر کے اختتام پر قرطبہ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے (جو ہمارے مستنصر حسین تارڑ کی نظر میں کالا شاہ کاکو کے اسٹیشن سے بھی گیا گزرا تھا) [۵] تو انھیں یوں لگا جیسے کسی پاکیزہ و منزہ اور بابرکت خطۂ زمین تک آپہنچے ہوں:

قبتہ الاسلام و مجمع اعلام الانام' ام القریٰ و قرارۃ اولے الفضل والتقی یعنی ام البلاد قرطبہ کی برگزیدہ سرزمین پر کھڑا تھا"۔ (ص ۱۷)

پھر غرناطہ پہنچے تو ان کے دل میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ: "کاش اجازت مل جائے تو الحمرا کے کسی گوشے میں چلہ کشی کروں' چپے چپے پر جبین نیاز ٹیکوں"۔ (ص ۲۲) قاضی ولی محمد کے سفرنامے میں یہ تیسرا رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ خود معترف ہیں: "اس کتاب میں بہ جز مرثیہ قومی کے' اور کچھ نہ دکھائی دے گا"۔ (ص ۳)

ڈاکٹر انور سدید نے قاضی صاحب کو بجا طور پر جدید سفرنامے کے پیش رووں میں شمار کیا ہے۔ [۶]

مستنصر حسین تارڑ' قاضی ولی محمد کا مداح ہے اور ان سے متاثر بھی۔ اس کا سفرنامہ: **اندلس میں اجنبی** (۱۹۷۶ء) [۷] "ایک کھلنڈرے' لاپروا اور کم علم سیاح کی آوارہ گردی کی داستان" ہے۔ (ص ۳۳) قاضی کی خوش باشی و رنگین مزاجی کا رنگ' تارڑ کے ہاں خاصا چوکھا ہے۔ یہ "کم علم سیاح" قصائی ٹونی جیسے سخت جاں سیاحوں سے نمٹنے اور ڈاکٹر ناژ لاسعد' مرسیڈس اور مس جان ہاورڈ جیسی دوشیزاؤں کی رفاقتوں اور صحبتوں سے لطف اندوز ہونے کا گر جانتا ہے۔ آغاز ہی میں وہ اپنے قارئین کو بُل فائٹنگ کے ذریعے اسپین سے متعارف کراتا ہے۔ سفرنامے کے پورے دو باب اسی قومی کھیل کی تفصیل پر مشتمل ہیں' جس میں ڈرامائیت بھی ہے اور سسپنس بھی۔ تارڑ ایک خالص اور کھرا سیاح

ہے اور بلاشبہ ایک کامیاب کہانی نویس بھی، مگر اس کے اندر کا "مور" چھپا اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ اسے نیل رنگ کی بالائی منزل میں "اسلامی طرز تعمیر کی خوب صورت محرابیں" اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ (ص ۴۷) قاری جوں جوں آگے بڑھتا ہے، اسے تارڑ پر، قاضی ولی محمد کے تیسرے رنگ کا سایہ پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت یہ تارڑ کا قصور ہے، نہ قاضی ولی محمد کا کمال، یہ نیرنگ اندلس کا سحر ہے جو اندلس کی جانب آنے والے ہر سیاح کو اس طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ وہ سیاح کی کینچلی اتار کر ایک زائر کا اِحرام باندھ لیتا ہے۔

چنانچہ ہمارے "کھلنڈرا، لاپروا اور خوش باش" مستنصر حسین تارڑ بھی، جب "اپنے وطن اندلس" میں بہ ظاہر "اجنبی" بن کر وارد ہوتا ہے تو اسے قدم قدم پر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ثوریا میں، اس کے ذہن میں مورّخ قاضی ولی محمد کی طرح، یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ مسلمان یہاں کب قابض ہوئے؟ زائر مستنصر، اس کا جواب دیتا ہے کہ متعصب تاریخ دان اس بارے میں مُہر بہ لب ہیں بلکہ ثوریا کے اسلامی دور کے بارے میں، اسلامی تاریخ میں بھی کوئی قابل ذکر حوالہ نظر نہیں آتا۔ (ص ۱۰۶)

اسی طرح مدینہ سالم سے گزرتے ہوئے، وہ بھی قاضی ولی محمد کی طرح سوچتا ہے کہ المنصور ابن ابی عامر یہیں کہیں، ان سفید مکانوں اور چٹیل پہاڑیوں تلے ابدی نیند سو رہا ہے۔ (ص ۱۲۵) میڈرڈ میں اسے یاد آتا ہے کہ یہ تو عربوں کا آباد کردہ مجریط ہے۔ وہاں سے برقی ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے قرطبہ کا "سحر انگیز" نام ایک نخلستان کی مانند اس کے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ: "یہ نخلستان، پیاس کے اس بھانبڑ کو بجھا سکے گا جو اوائل عمری سے لے کر اب تک اس شہر اور اس کی تاریخ نے میرے اندر مچا رکھا ہے؟" (ص ۱۴۸)

محمد حمزہ فاروقی (آج بھی اس دیس میں، ۱۹۸۲ء) [۸] کے ہاں مورّخانہ رویہ غالب ہے اور سیاح، مغلوب۔ فروری ۱۹۷۹ء میں الیقانتے، میڈرڈ، اِسکوریال، قرطبہ، اِشبیلیہ اور غرناطہ سے گزرتے ہوئے انھیں حال کی دل چسپیوں اور رنگینیوں کے بجائے، ماضی کے نقوش میں زیادہ دل کشی محسوس ہوئی۔ وہ عربوں کے شاندار کارناموں: ان کی زراعت،

آب رسانی، ذوق باغ بانی، صنعت و تجارت، مواصلاتی نظام، تعمیرات کے بے مثال نمونے، محلات، سرائیں، حمام، قلعے، فصیلیں، مہمان خانے، علوم و فنون سے گہری دل چسپی اور ان کی کتاب دوستی کی تعریف میں کچھ یوں رطبُ اللسّان ہیں کہ کہیں کہیں "پدرم سلطان بود" کا تأثّر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ شکستہ مساجد، ان کے "دل پر ناقابلِ برداشت بوجھ" (ص ۵۵) بنتی ہیں، عیسائیوں کے تعصب، بے اعتنائی اور تنگ نظری کا احساس گہرا ہو جاتا ہے اور وہ حسرت و یاس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے ہاں زائرینِ اندلس کی روایتی افسردگی، تأسّف اور محرومی کے احساسات چھائے ہوئے ہیں:

○ "یہ شہر جو کسی دور میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھا، اب وہ علوم اور اسلام، اس کی فضاؤں میں اجنبی تھے۔ دوپہر کے وقت میں ایک قہوہ خانے میں گیا تو وہاں دیوار پر جو ٹائلیں نصب تھیں، ان ٹائلوں پر عربی عبارت اور عربی نقش و نگار تھے۔ عربوں کی روایات کسی نہ کسی شکل میں زندہ تھیں لیکن مسلمان اس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے بے دخل ہو چکے تھے۔ اس سرزمین سے ہزاروں مساجد، مدارس، خانقاہوں اور محلات کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا۔

○ "میرا تعلق اس بدنصیب قوم سے تھا جس کے گلشن خزاں دیدہ پر کبھی بہار بھی آئی تھی۔ اب اس چمن میں بُوم بَسے یا ہُما رہے، مسلمان تو ہمیشہ کے لیے اس ملک کے لیے اجنبی ہو گئے تھے"۔ (ص ۵۵)

گو، وہ ہمیشہ عربوں کے آثار کی "زیارت" میں دلچسپی لیتے ہیں، مگر سفرنامے میں مشاہدے کا بیان کم ہے اور مطالعے کی تفصیل زیادہ۔ بعض ابواب، جیسے: "مسلم اندلس" یا "قدیم و جدید" (ص ۵۷ تا ۸۷) باقاعدہ کسی تاریخ کے ابواب معلوم ہوتے ہیں۔ اوراقِ تاریخ کا یہ سفر، بہ قول ڈاکٹر وحید قریشی: "مسلمان کے باطن کی تلاش و جستجو پر مشتمل ہے۔ تاریخی عمارتوں کے پس منظر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان اور اسپین کی دورِ حاضر کی زندگی میں ماضی کے نقوش کی بازیافت، اس سفرنامے کا محور ہے"۔ (دیباچہ: ص ۱۰)۔

رفیق ڈوگر (اندلس کی تلاش، ۱۹۸۸ء)[۹] نے مسلمانانِ اندلس کے عروج و زوال

کی کہانی کو، تاریخ کے تناظر میں دیکھا ہے۔ بارسیلونا، الیقانتے، مرسیہ، غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اور میڈرڈ کے مشاہدات اور احوال سفر کا سیاحتی بیان مختصر ہے (پہلا، دوسرا اور آخری باب)۔ ایک باب بل فائٹنگ پر بھی باندھا ہے مگر یہ محض رسمیات سیاحت کی خانہ پری کے لیے ہے "تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ تم نے پھر کیا دیکھا"؟ ڈوگر کے ہاں ایک سیاح کا استعجاب، معصومیت یا ایک اجنبی سرزمین کے بارے میں کچھ جاننے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان تقریباً مفقود ہے۔ وہ ایک کہنہ سال خرد مند دانش ور کی طرح نقوش ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اندلس میں زوال مسلم کے نوحہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں رثائی رنگ، دوسروں کی نسبت زیادہ تیز اور گہرا ہے۔

○ "آہ، مرسیہ! تو روشنیوں کے سیلاب میں بہ گیا۔ تیری گلیاں علم کے نور سے منور تھیں۔ لوگ ہزاروں میل سے چل کر تیرے بحر علم سے اپنی اپنی چونچ تر کرنے آتے تھے، گلی گلی اور محلے محلے میں علمی محفلیں ہوتیں، رموز کائنات پر بحث ہوتی، اسی بحث میں تیرے عالم رموز مملکت سے غافل ہو گئے اور مملکت جو گئی تو روشنی بھی نہ رہی"۔ (ص ۳۳)

○ "اس افق پر ایک بار ہم ستارۂ صبح کی مانند بھی طلوع ہوئے تھے۔ روشنی کا پیغام لے کر آئے اور روشنی کی رفتار سے، اندلس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے۔ جب وادیوں اور پہاڑوں پر روشنی پھیل گئی تو ہم اس روشنی میں راستہ بھول گئے۔ اندلس کی اسلامی سلطنت کے ساتھ اسلامیان اندلس بھی برباد ہو گئے۔ آج کتابوں میں ان کی داستانیں ہی باقی ہیں۔ اندلس کی وادیوں میں ان کی عظمت کے کھنڈرات پھیلے ہیں۔ لوگ سیکڑے ہزار میل سے چل کر ان کھنڈرات کی زیارت کو آتے ہیں۔ میں بھی انھی زائرین میں سے ایک تھا"۔ (ص ۱۴)

یہ سفرنامہ، اندلس کے مرحوم مسلمانوں کا ایک طویل مرثیہ ہے، جسے نہایت جذباتی انداز میں اور ایک شدید رومانوی احساس کے ساتھ لکھا گیا ہے مگر اس کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ یہ نوحہ گری، ماتم یک شہرِ آرزو تک محدود نہیں رہتی بلکہ رفیق ڈوگر، سقوط اندلس کو مسلم تاریخ کے ایسے ہی دوسرے المیوں سے مربوط کر کے، بعض سوالات اٹھاتے ہیں۔ "سقوطِ الحمرا (۱۴۹۲ء) کا سبب زوال دانش تھا یا دانش زوال؟" (ص ۶۱) برعظیم ہند

میں ۱۸۵۷ء کا حادثہ غلامی پیش آیا' پھر سقوط ڈھاکا (۱۹۷۱ء) کا المیہ رونما ہوا۔ رفیق ڈوگر قارئین کو بھی غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں' ان کا سوال ہے: "۴۸۰ سال کے بعد بھی ہمارے ہاں ابو عبداللہ ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ کسی اور قوم نے مسلمانوں جتنے ابو عبداللہ کیوں پیدا نہیں کیے"؟ پھر وہ اس کا جواب بھی مہیا کرتے ہیں کہ اس طرح کے المیوں کا ایک بڑا سبب ہوس اقتدار ہے' جس نے مسلمانوں کو خانہ جنگی کی راہ دکھائی۔ (ص ۵۸)

لندن سے غرناطہ (۱۹۹۴ء) [۱۰۱] میں' آغاز سفر ہی سے ڈاکٹر صہیب حسن کے ہاں آثار اسلامی خصوصاً زیارت مساجد کا شوق و اشتیاق نمایاں ہے۔ انھوں نے ماضی کے بجائے' زیادہ تر حال کے دائرے میں سفر کیا ہے۔ اندلس کے دوسرے سفرنامہ نگاروں کی طرح وہ بھی تاریخ گذشتہ کے اوراق پلٹتے ہیں مگر ذکرِ ماضی ان کے ہاں فقط ضمنی حیثیت رکھتا ہے' وہ مرثیہ نہیں کہتے۔ اجنبی سرزمین میں کہیں کوئی مسجد نظر پڑتی ہے تو وہ اسے شوق و استعجاب سے دیکھتے اور ایک عجیب سرخوشی و مسرت سے سرشار ہوتے ہیں۔ (ص ۱۰۳) مسجد قرطبہ میں بہ آواز بلند اذان دینے کے لمحات' ان کے لیے "متاعِ زیست کا انمول سرمایہ" (ص ۸۹) بنتے ہیں اور مسجد میں سجدہ' ان کے اندر ایک "لازوال مسرت کا احساس" تازہ کر جاتا ہے۔

اندلس کے دوسرے سیاحوں اور زائرین کی طرح ڈاکٹر صہیب حسن بھی سرزمین اندلس کی خوب صورتی و رعنائی اور تازگی و شادابی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دو ہفتے کے سفر میں انھوں نے بارسیلونا' طرطوشہ' بلنسیہ' مرسیہ' غرناطہ' قرطبہ' اشبیلیہ' قادس' طریف' جبل طارق' مالقہ' ماربیلا' لینارس' طُلَیطُلہ' میڈرڈ' اسکوریال' برغس' بلباؤ اور سانتادیر کی سیاحت کی۔ قاضی ولی محمد کے بعد' ہمارے سیاحوں میں' وہ دوسرے زائر ہیں جنھیں اندلس کے اتنے زیادہ شہروں کو دیکھنے اور خاصے وسیع علاقوں میں گھومنے کا موقع ملا۔ ہمارے جملہ سفرنامہ نگاروں کی نسبت ان کا زاویۂ سیاحت زیادہ مثبت اور حقیقت پسندانہ ہے۔ گو' دوسروں کی طرح وہ بھی اندلس میں زوالِ مسلم پر افسردہ ہوتے ہیں اور اہل کلیسا کی مسلم دشمنی' ان کے تعصب اور فریب کاری کا ذکر بھی کرتے ہیں' مگر خاصے اعتدال کے ساتھ۔ ایک جگہ وہ اپنے قارئین کو تاریخ کے ایک دل چسپ (مگر عبرت

ناک) مذاق کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جس وقت (۱۴۵۳ء) عثمانی سلطنت، استانبول پر اسلامی جھنڈا لہراتے ہوئے، یورپ کے مشرق میں داخل ہو رہی تھی، انھی ایام (۱۴۶۲ء) میں یورپ کا مغربی دروازہ جبل الطارق، عیسائیوں کے آگے سر خم کر چکا تھا۔ (ص ۷۲، ۷۳)

جناب صہیب حسن کا تعلق ایک مذہبی خانوادے سے ہے۔ اجنبی سرزمین میں انھیں عربوں اور مسلمانوں سے مل کر قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ حسب موقع وہ صبح کی سیر کو بھی وسعت معلومات کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا تجربہ ایک باخبر اور باذوق سیاح کا ہے۔ اندلس کی اس لمبی سیاحت میں جناب صہیب حسن اور ان کے ہم ذوق اور مزاج آشنا دوست ڈاکٹر احمد زمان (اپنے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ) دو موٹروں میں سفر کر رہے تھے۔ موٹر کے سفر میں انھیں، ایک گونہ سہولت کے ساتھ، طرح طرح کے مسائل اور پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ رسمیات سفر کا حصہ تھا، چنانچہ انھوں نے خندہ پیشانی سے اس کا سامنا کیا، اور ایک سیاح کی فطری بشاشت کے ساتھ وہ اندلس کے حسن و جمال سے لطف اور مسرت کشید کرتے رہے:

○ "فرانس تک اجنبیت کا احساس غالب تھا لیکن ہسپانیہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ماحول بدلا بدلا دکھائی دیا۔ سرحدی قصبے Laparthoos کی آبادی بالکل ہمارے وطن کے قصبات کی مانند ہے۔ بے ترتیب سے منظم، اونچے نیچے مکانات، کچھ پختہ اور کچھ کچے لیکن اجلے اور زندگی سے بھرپور۔ معلوم ہو رہا تھا ہم مصنوعی بلندیوں سے گزر کر انسانیت کی سطح پر آ گئے ہیں۔ یقیناً یہ میرے اسلاف کا ملک ہے، میری اپنی تہذیب کا حال ہے۔ نہیں، یہ میرا اپنا وطن ہے"۔ (ص ۳۹)

○ "صبح ناشتے کے بعد سانتادیر کا رخ کیا۔ راستہ اونچا نیچا اور پہاڑیوں کے دامن کو چھوتا چلا جا رہا تھا۔ تنگ سڑک اور ٹریفک کی بنا پر بیس میل تک کا فاصلہ رینگتے گزرا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے خلیج بسکے کے نیلگوں پانی کی جھلک نظر آئی۔ ہم ایک اونچی چٹان پر تھے جہاں سے قدرے گہراؤ میں سمندر اپنی آغوش وا کیے ہوئے تھا۔ سرسبز مرغزاروں اور کھلکھلاتے پھولوں کے نیچے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰر کا دنیوی عکس نظر آیا۔ اللہ رے تیری قدرت،

جب مجازی جنت اتنی حسین ہے تو حقیقی جنت کا کیا کہنا"۔ (ص ۱۲۳)

ڈاکٹر صہیب حسن نے اندلس کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے' ایک سوال بھی اٹھایا ہے' لکھتے ہیں:

"ہم نے بوجھل دل کے ساتھ قلعے کی فصیل سے' طرطوشہ پر ڈھلتے ہوئے سورج کی شعاعوں کو' نمناک آنکھوں سے دیکھا۔ سات صدی قبل طرطوشہ کے آخری مسلمان نے ایسا ہی نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا۔ کیا معلوم کہ اسپین' احیاے اسلام کی جس رو سے گزر رہا ہے' اس کی کوئی لہر دریاے ایبرو کی گود میں آباد اس عظیم بستی کو از سر نو شاد کام کر دے"۔ (ص ۵۱)

اندلس کے سفرناموں میں ماضی کا تذکرہ مفصل' اور حال کا ذکر نسبتاً مختصر ہے۔ رہا مستقبل' تو اس بارے میں تو شاید ڈاکٹر صہیب حسن ہی نے پہلی بار سوال اٹھایا ہے۔

اس کا جواب مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے سفرنامے: اندلس میں چند روز[۱۱] (۱۹۹۳ء) کے اختتام پر دیا ہے۔ مولانا کے رفیق سفر سعید صاحب نے' بے ساختہ ان سے سوال کیا: "کیا کبھی مسلمان' اس خطے کو دوبارہ ایمان سے منور کر سکیں گے؟"---- عالم اسلام کے موجودہ تناظر میں عثمانی صاحب کا جواب بہت حقیقت پسندانہ (اور عبرت انگیز) تھا: "اس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اور اس بات کا انتظام کر لیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے"۔ (ص ۵۱)

مولانا عثمانی کی دو روزہ روداد' زیادہ تر تاریخ اندلس کے احوال و تبصرے پر مشتمل ہے۔ تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ برمحل اشعار اور سادہ رواں نثر میں مسلم عظمت رفتہ کا تذکرہ و تبصرہ۔ سطح مرتفع کے قدرتی حسن سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں مگر یہ مناظر انھیں بے اختیار ماضی میں کھینچ لے جاتے ہیں:

"تاریخی واقعات کی بزم' تصور میں سجائے' ہم نے غرناطہ جانے والی سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ آسمان پر ہلکا ہلکا ابر تھا اور سڑک چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ پہاڑیوں کی سطح پر اور درمیانی وادیوں میں زیتون کے حسین درخت بڑے توازن اور تناسب کے ساتھ حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ تصور کی نگاہیں پہاڑیوں اور وادیوں

کے اس نشیب و فراز میں، مجاہدین اسلام کے اولوالعزم قافلوں کو اترتا چڑھتا دیکھ رہی تھیں"۔
(ص ۱۴)

اپنے جذباتی رویوں کی وجہ سے ہمارے سفرنامہ نگاروں نے اس سوال پر کم ہی غور کیا ہے کہ اندلس میں زوال مسلم کا سبب کیا تھا؟ ایک حد تک رفیق ڈوگر نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے یا پھر زیر نظر سفرنامے میں، اس کا حقیقت پسندانہ جواب دیا گیا ہے:

"بہ ظاہر وہ زمانہ جس میں مدینۃ الزہرا تعمیر کیا گیا، اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا اور اس جنت ارضی کو دیکھ کر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں لرزہ براندام ہو جایا کرتی تھیں لیکن اگر حقیقت شناس نگاہ سے دیکھا جائے تو اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا آغاز، انھیں عشرت کدوں کی تعمیر سے ہوا، جنھوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں سے ان کا زہد، ان کی جفاکشی اور ان کی بے تکلف زندگی کی قوت چھین لی"۔ (ص ۴۲)

راقم الحروف کا سفرنامہ پوشیدہ ترک خاک میں --- (مطبوعہ: نقوش ۱۹۹۷ء، بہ عنوان: سفرنامہ اندلس) ۱۲-۵ نومبر ۱۹۹۱ء میں زیارت قرطبہ و غرناطہ اور اشبیلیہ کی دو ہفتے کی روداد ہے۔ اپنی ہی تحریر پر تبصرہ یا کوئی تنقیدی رائے دینا مشکل ہے اور نامناسب بھی، تاہم مختصراً کہہ سکتا ہوں کہ اس میں بھی کم و بیش وہی رنگ اور رویے جھلکتے ہیں، جن کا ذکر، دیگر سفرناموں کے ضمن میں ہوا۔ البتہ زیارت آثار میں تاریخی پس منظر کے ذریعے، تفصیل و جزئیات کی فراہمی شاید دوسروں سے زیادہ ہو گی۔ راقم کی طبعی آوارہ خرامی اور مشاہدات سفر کا بیان تو ملے گا، مگر اس میں قاضی ولی محمد یا تارڑ کی طرح رنگین صحبتوں یا جلسوں کا ذکر مفقود ہے۔ دیباچے سے چند سطریں:

"راقم نے ان اوراق کو معاصر سفرنامے کی طرح فکشن یا فینٹسی نہیں بنایا البتہ اس روداد سفر میں تاریخ اندلس کے حوالے ضرور ملیں گے۔ اندلس کے سیاح کے لیے تاریخ کے حوالے، یا فلیش بیک بالکل ایک فطری عمل یا ردعمل ہے۔ اندلس کا کوئی بھی مسلمان سیاح کتنا ہی معروضی بننے کی کوشش کرے، یہ کوشش مصنوعی ہو گی اور اسی لیے ناکام بھی۔ اندلس میں قدم قدم پر ایک حسرت اور ایک متاسفانہ احساس سے دوچار ہونا بالکل فطری امر ہے، تاہم راقم نے اس روداد کو مرثیہ بنانے سے گریز کیا ہے"۔

اے حمید نے **قرطبہ کی خاموش اذانیں (۱۹۹۶ء)** [۱۳] کو "اسلامی سپین کی عظمت گم گشتہ" کے "دل گداز، عبرت انگیز سفرنامہ" کے طور پر پیش کیا ہے۔ بلاشبہ اس کا ظاہری ڈھانچا سفرنامے کا ہے، مگر اپنے مندرجات کی روشنی میں یہ "مہماتی، رومانوی اور تحیر خیز ناولوں" کی قسم کی ایک پیشہ ورانہ اور کاروباری کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اگر مصنف نے فی الواقع ہسپانیہ کا سفر کیا (معلوم نہیں کب؟) تو بھی انھوں نے سفر کے احوال و مشاہدات میں مبالغے، رومانس، مہم جوئی اور تحیر کے عناصر اس کثرت سے داخل کر دیے ہیں کہ کتاب اچھی خاصی فینٹسی بن گئی ہے۔

اندلس میں مسلم عظمت رفتہ کا ذکر اور زوال و ادبار پر نوحہ گری و مرثیہ خوانی تو خیر، ہر سفرنامے کا لازمی عنصر ہے مگر اس ضمن میں اے حمید کے بعض تضادات، تاریخ اور جغرافیے کے باب میں ان کے ناقص شعور کی چغلی کھاتے ہیں، مثلاً: غرناطہ کا آخری حکمران ابو عبداللہ، بعض مقامات پر "ابی عبداللہ" ہے اور کہیں: "باب عادل"۔ "مور کی آہ" (Sigh of the Moor) نامی پہاڑی چوٹی، غرناطہ کے نواح میں تقریباً ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اے حمید نے اس کا ذکر آبنائے جبرالٹر کے قریب کیا ہے۔ ص ۱۵ اور ۱۹ پر انھوں نے "جلاوطن عباسی شہزادوں" کا ذکر کیا ہے۔ شہزادہ تو ایک ہی اندلس پہنچا تھا، وہ بھی اُموی تھا، نہ کہ عباسی۔ الحمرا کی تفصیلات میں بھی بعض باتیں درست نہیں ہیں۔ ص ۲۸۳ پر ایک جملہ ہے: "میری آنکھیں اپنے آپ مسجد قرطبہ کے میناروں کی طرف اٹھ گئیں" حالانکہ مسجد قرطبہ کا صرف ایک مینار ہے۔ سباطی، ایلس، دونا فران سسکا اور خانہ بدوش کرداروں کی پیش کش میں مبالغے اور بناوٹ کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

کیا واقعی یہ اندلس کا حقیقی سفرنامہ ہے؟---- مجھے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

متذکرہ بالا نو سفرناموں کے علاوہ، متعدد اہل قلم نے مختصر مضامین کی شکل میں سفر اندلس کے تاثرات و مشاہدات قلم بند کیے ہیں۔ اس ضمن میں منظور الٰہی، اشفاق احمد اور قرۃ العین حیدر کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔

منظور الٰہی کے متعدد مضامین (اے گلستانِ اندلس، عروس البلاد، اشبیلیہ وغیرہ) [۱۴]

میں ان کے مشاہدات اندلس کی دل آویز جھلکیاں بکھری پڑی ہیں۔ مطالعہ تاریخ اور چشم دید تجربے کی آمیزش نے، مصنف کے دل کش اسلوب میں کچھ ایسی شکل اختیار کرلی ہے کہ نہ تو یہ روایتی سفرنامہ ہے اور نہ محض تاریخی بیانات---- بلاتامل کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اندلس کا ایسا وسیع و عمیق مطالعہ ہمارے کسی اندلسی سیاح نے نہیں کیا اور نہ کوئی سفرنامہ نگار ایسی خوب صورت ادبی نثر لکھنے پر قادر ہو سکا۔ مصنف کے ہاں، ایک مستقل حزینہ متاسّفانہ لہجہ زوال اندلس کے المیاتی پہلو کی شدت کو نمایاں کرتا ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اندلس میں زوال مسلم کے اسباب پر بعض سفرناموں (رفیق ڈوگر، محمد تقی عثمانی، رفیع الدین ہاشمی) میں کچھ اشارات ملتے ہیں۔ منظور الٰہی نے اس ضمن میں پتے کی بات کہی ہے:

"اپنے تحفظ کی خاطر اقوام عالم نے مذہب کو اپنایا، لیکن ملت اسلامیہ نے متعدد بار اس سے انحراف کیا۔ اللہ نے حکومت کو اپنا انعام قرار دیا، ہسپانیہ کے مسلمانوں نے اس کی قدر نہ کی اور لوح جہاں سے مٹا دیے گئے۔ صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق بھلا دینے والے امامت کے سزاوار کیوں کر ٹھہرتے؟" [۱۵]

یہ مضامین، معنویت کے اعتبار سے، اندلس کے مستقل سفرناموں سے زیادہ اہم ہے۔ جذباتی کیفیات کو حقیقت کے محدود سانچے میں پیش کرنے کا ہنر، منظور الٰہی پر ختم ہے۔

جناب اشفاق احمد نے اپنے دو مضامین "عرشِ منوّر" اور "ہے تو رو" میں اپنے مخصوص افسانوی اور کسی قدر علامتی انداز میں قرطبہ و غرناطہ کی روداد سفر پیش کی ہے۔ [۱۶] قدیم اندلس اور اہل اندلس سے، لکھنے والے کا جذباتی لگاو واضح ہے۔ محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ ایک طویل بن باس کے بعد، اپنے آبائی گانو لوٹا ہے جہاں اس کے آبا و اجداد نواحی قبرستان میں دفن ہیں۔ اشفاق احمد کے ہاں تاریخی حقائق کے ذکر میں وہی احساس تفاخر اور وہی المیاتی فضا ملتی ہے جو اندلسی سفرناموں کا خاصا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے مختصر مضمون "مور کی آہ" [۱۷] میں مسلم اندلس کی عظمت و سطوت، دانش وری، حسن و جمال، زرخیزی و شادابی اور پھر مسلم زوال و ادبار اور

سقوط غرناطہ پر اپنے مخصوص اسلوب میں ایک متاسفانہ تاثر پیش کیا ہے۔ بہ طور خاص اس تاثر میں، انھوں نے عیسائی تعصب اور بے دانشی کا تذکرہ بھی کیا ہے:

"سنو، بے شمار شکست خوردہ اندلسیوں کو جبراً اصطباغ دیا گیا تھا۔ نئی عیسائی حکومت نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ باقی یورپیوں کی طرح نہانا ترک کر دیں۔ ۱۵۶۷ء میں فلپ دوم نے الحمرا کے تمام حمام توڑ ڈالے کہ مفتوح مسلمان نہانے سے باز رہیں"۔ (ص ۱۸)

ڈاکٹر سعید اختر درانی نے متعدد بار ہسپانیہ کی سیروسیاحت کی۔ انھوں نے ایک مضمون میں الیقانتے، غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ اور اویلا کے مشاہدات و تاثرات کی مختصر جھلکیاں پیش کی ہیں۔ [۱۸] ان کے ہاں ہسپانیہ کے قدرتی حسن و جمال اور فطری مناظر کی تعریف و تحسین، منہدم مساجد پر تاسف اور "گزرے ہوئے دور اسلامی کی ضوفشاں تہذیب و تمدن پر" فخر و افتخار کا رویہ نمایاں ہے۔

جناب وحید الدین خاں نے "سفرنامہ اسپین" [۱۹] میں قاری کو اپنے بے حد و حساب علم و فضل، وسیع و عریض مطالعے اور دنیا جہان کے بارے میں اپنی معلوماتِ فراواں کی تو سیر کرائی ہے مگر قرطبہ، مسجد قرطبہ، غرناطہ، الحمرا اور میڈرڈ کے مشاہداتِ سفر کا بیان فقط دو تین صفحات تک ہی محدود رکھا ہے۔ اس بیان سے بھی کچھ واضح نہیں ہوتا کہ ان کی زیارت قرطبہ و غرناطہ "جسمانی" تھی یا "روحانی"؟---- البتہ تاریخ اندلس، قوموں کا عروج و زوال، مستشرقین، مسلمانوں کا غلط طرز فکر، ان کی نادانیاں، سلطنت عثمانیہ، جرمنی کے مسلمان، سبھاش چندر بوس، گاندھی وغیرہ وغیرہ--- کیا کچھ نہیں ہے اس "سفرنامے" میں، ماسوا مشاہدۂ سفرِ اندلس کے۔

وہ اس بات سے خفا ہیں کہ مولانا حالی اور علامہ اقبال جیسے مسلم دانش ور اندلس کے باب میں "مرثیہ خوانی میں مبتلا ہیں" (ص ۱۳)۔ سقوط غرناطہ پر اندلسی شعرا کا آنسو بہانا بھی "اسلامی روح کے خلاف ہے" (ص ۱۸)۔ اقبال پر تو انھیں زیادہ تعجب ہے کیوں کہ اقبال پر کائنات میں موجود اللہ کی عظیم تر نشانیوں کا تو کچھ اثر نہ ہوا، البتہ "مسجد قرطبہ کے در و دیوار کو دیکھنا ان کے جذبات کے تاروں کو چھیڑنے کا سبب بن گیا" (ص ۴۱)۔ خاں صاحب خود کلامی کے بادشاہ ہیں، اور بادشاہوں کی طرح ان کی ساری باتیں ہی نرالی ہیں۔ (سب کا

تذکرہ یہاں ممکن نہیں)۔

ایک آدھ مقام پر ان کے قلم سے اندلس کے دیگر سفرنامہ نگاروں کی سی روایتی بات نکل ہی گئی ہے، میڈرڈ سے روانگی کی صبح انھیں احساس ہوا کہ "جہاں یہ ہوٹل کھڑا ہے، عین ممکن ہے کہ اس زمین پر اللہ کے کسی بندے نے سجدہ کیا ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہاں کی فضائیں، کسی مومن کی آہوں اور آنسوؤں کی امین ہوں" (ص ۸۵)۔ یعنی: ع پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں۔

۳

اندلس کے سفرناموں میں ایک گونہ تنوع کے باوجود، زائرین کے خیالات و رجحانات اور رویوں میں خاصی مماثلت نظر آتی ہے۔ زائرین کے متخیلہ کو اوراق تاریخ سے بیش بہا مدد ملتی ہے۔ خارج کے مناظر، ان کے داخلی احساسات کو متحرک کرتے ہیں۔ سفرنامہ نگار قاری کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے تو ایک شاندار اور پرشکوہ تاریخ کے روشن و منور اوراق اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ کبھی یہ روشنی، اس کے لیے ایک داخلی کش مکش کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ وہ حال کی دنیا میں سفر کرنا چاہتا ہے، مگر ایک پرشکوہ ماضی کی رعنائیاں، اسے اپنے اندر جذب کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ اندلس اس کے لیے بہ منزلہ محبوب کے ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت، اپنے محبوب کی چاہت میں اسیر، اس دوشیزہ کی سی ہوتی ہے، جس کے جذبات کی ترجمانی احمد راہی نے ایک نظم میں اس طرح کی ہے:

جے میں ذدھ رِڑکاں

تیری یاد آوے

آ کے کرے چُھلاں

ہن دَس مینوں

تینوں یاد کراں کہ میں ذدھ رِڑکاں

جے میں پاواں پُونی

تیری یاد آوے
کھچ ہووے دونی
ہُن دَسُ مینوں
تینوں یاد کراں کہ میں پاواں پونی

جے میں گیت گاواں
تیری یاد آوے
گیت بنے ہاواں
ہُن دَسُ مینوں
وے میں گیت گاواں کہ میں بھراں ہاواں

جے میں چپ رہواں
تیری یاد آوے
گجھے دکھ سہواں
ہُن دَسُ مینوں
وے میں چپ رہواں کہ میں دُکھ سہواں [۱۹]

اندلس کا سیاح بھی، ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک عام سیاح کی حیثیت سے موجودہ ہسپانیہ کی تہذیب و ثقافت کے مختلف مظاہر، رسوم و رواج، طور طریقوں، میلوں ٹھیلوں، بل فائٹنگ اور زندگی کی دیگر دل چسپیوں کے بارے میں کچھ جاننے کا مشتاق ہوتا ہے، تو دوسری طرف مسلم آثار و نشانات قدم قدم پر اس کی راہ روکتے، اس کا دامن دل کھینچتے اور اسے اپنی طرف بلاتے ہیں کہ جا ایں جا ست۔ مسجدوں کے میناروں، قلعوں، فصیلوں، حماموں، حویلیوں، سراؤں اور پن چکیوں کے باقیات، پھر علامہ اقبال کی نظموں اور نسیم حجازی کے ناولوں کی پَروُردہ پر شکوہ رومانیت اسے تاریخ کے ایوانوں میں لے جاتی ہے۔

کسی خطے سے مسلمانوں کا اتنے بڑے پیمانے پر اخراج (exodus) تاریخ عالم کا ایک بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس کی پھانس ہر زائر اندلس کے سینے میں اٹکی ہوئی ہے۔ وہ قرطبہ و غرناطہ میں بکھرے ہوئے نقوش ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ: "اندلس کی فضائیں اداس ہیں' اس کے در و بام پر ایک ناقابل بیان افسردگی' سحر کی طرح مسلط ہے"۔ [۲۱] وہ عہد رفتہ کو یاد کرتا ہے اور پر شکوہ ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ طارق بن زیاد' موسیٰ بن نُصیر' عبدالرحمٰن الغافقی' عبدالرحمٰن اول' کھجور کے درخت' مسجد قرطبہ' مدینۃ الزہرا' الحمرا کے ایوان و محلات' غرناطہ کا آخری اور ننگ ملت تاج دار ابوعبداللہ اور ترکش کا آخری تیر موسیٰ بن ابی غسّان جو دریاے شنیل کی لہروں میں کہیں کھو گیا: ع ایسی چنگاری بھی یارب' اپنی خاکستر میں تھی۔

اندلس کے تمام اردو سفرناموں میں حال اور ماضی آپس میں گتھم گتھا نظر آتے ہیں۔ ہمارے سیاح بہ یک وقت حقیقت اور خواب کی دنیاؤں میں سفر کرتے ہیں۔ سوتے جاگتے کی اس کیفیت نے اندلس کے سفرناموں کو' اردو کے ذخیرۂ سفری ادب میں خاصا دل چسپ اور منفرد بنا دیا ہے۔

حوالے

۱۔ مطبوعہ: مطبع نظامی کان پور' ۱۸۹۸ء' ۱۵۶ ص۔

۲۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین: "سپین: اردو کے سفرناموں کے آئینہ میں" مشمولہ: اندلس کی اسلامی میراث' خصوصی شمارہ: فکرونظر اسلام آباد' اپریل تا دسمبر۱۹۹۱ء) ص ۴۱۴۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب میں سفرنامہ' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور' س ن' ص ۱۵۸۔

۴۔ مطبوعہ: نامی پریس' لکھنؤ' ۱۹۲۷ء' ۲۸۸ ص۔

۵۔ اندلس میں اجنبی: سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۹۳ء' ص ۱۵۶۔

۶۔ حوالہ ۳' ص ۲۶۵۔

۸۔ طبع اول: التحریر، لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۸۔ مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۲ء، ۱۱۸ ص۔

۹۔ مطبوعہ: دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ۲۶۱ ص۔

۱۰۔ صہیب حسن کا یہ سفرنامہ "اندلس کا سفرنامہ" کے عنوان سے ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ، لاہور کے جولائی تا اکتوبر اور دسمبر ۱۹۸۸ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ بعدازاں ۱۹۹۴ء میں مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور سے لندن سے غرناطہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا، صفحات: ۱۴۲۔

۱۱۔ ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۹۳ء، ۵۱ ص۔

۱۲۔ نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ، یہ سفرنامہ پوشیدہ تری خاک میں ... کے نام سے بہت جلد شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

۱۳۔ غالب پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۲۸۳ ص۔

۱۴۔ مشمولہ: در دل کشا نقوش پریس، لاہور، ۱۹۸۴ء، اور: نیرنگ اندلس سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۱۵۔ در دل کشا، ص ۴۲۔

۱۶۔ مشمولہ: سفرمینا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۱۷۔ مشمولہ: جہان دیگر، مکتبہ اردو ادب، لاہور، س ن۔

۱۸۔ مشمولہ: اقبال یورپ میں، ڈاکٹر سعید اختر درانی، فیروز سنز، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۹، ص ۲۷۴ تا ۲۷۸۔

۱۹۔ مشمولہ: رسالہ التذکیر، اگست ۱۹۹۵ء۔

۲۰۔ احمد راہی: ترنجن، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ۱۷۷ تا ۱۷۸۔

۲۱۔ منظور الٰہی: حوالہ ۱۵، ص ۲۲۔

پاکستان میں اقبالیاتی ادب

(۱۹۴۷ء - ۱۹۹۶ء)

علامہ اقبال نے اپنی تحریروں، خصوصاً خطبہ الٰہ آباد اور جناح کے نام خطوط میں، ہندی مسلمانوں کے لیے ہندستان کے شمال مغربی خطے میں ایک علاحدہ وطن کی تجویز و تمنا کا اظہار کیا تھا۔ گو، انھوں نے اس کے لیے کوئی نام تجویز نہیں کیا تھا، مگر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہونے والی مملکت خداداد--- پاکستان--- علامہ اقبال ہی کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ علامہ اقبال کی حیثیت بھی، ایک اعتبار سے، بانی پاکستان ہی کی ہے چنانچہ قیام پاکستان کے بعد یہاں کے سیاسی، تعلیمی اور علمی و ادبی حلقوں میں ذکر اقبال اور مطالعہ اقبال کی جانب ایک رغبت و اعتنا بالکل فطری بات تھی۔ اقبال کی تعریف و تحسین کے ساتھ ان پر ادبی نقد و انتقاد، کلام اقبال کی توضیح و تشریح اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہونے لگے۔ اس طرح اقبالیات، ایک علمی و ادبی شعبے کی حیثیت سے رو پذیر ہونا شروع ہوا۔ محدود پیمانے پر ۱۹۷۳ء میں اقبال کا صد سالہ یوم ولادت منایا گیا۔ بعدازاں، جب ۱۹۷۷ء کو سرکاری طور پر "اقبال صدی" کا نام دیا گیا تو نہ صرف پاکستان، بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں مطالعہ اقبال کے رجحان میں اضافہ ہونے لگا۔

حکومت پاکستان کی سرپرستی میں لاہور میں، ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء، پہلی عالمی (اور تاحال تاریخ اقبالیات کی سب سے بڑی) اقبال کانگرس منعقد ہوئی۔ سال اقبال کے دوران میں تعلیمی اور علمی اداروں میں وسیع پیمانے پر تقریبات منعقد ہوئیں۔ ملک میں ایک عمومی

اقبالیاتی فضا پیدا ہوتی گئی۔ ہمارے اہل قلم اور ناشرین نے بھی محسوس کیا کہ اقبالیات ایک پر کشش موضوع ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں اقبالیاتی ادب کا ایک متنوع سیلاب امڈ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے رطب و یابس کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اقبالیات پر چھوٹی بڑی کتابوں اور مجلات کے خاص اقبال نمبروں کی تعداد دو ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے۔ (ہزارہا مضامین و مقالات ان کے علاوہ ہیں) اس بحر زخار کا تقریباً تین چوتھائی حصہ "اقبالیات پاکستان" کا ہے۔ یوں اردو ادب کی اس نئی اور نوخیز صنف ادب "اقبالیات" نے اردو کی دیگر اصناف کے مقابلے میں نسبتاً ایک مختصر عرصے میں، حیرت انگیز برق رفتاری کے ساتھ پیش رفت اور ترقی کی ہے۔ اقبالیات کی اس سریع فروغ پذیری کو علامہ اقبال کی طلسماتی شخصیت کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔

پچاس برسوں میں اقبال کے تعلق سے وجود میں آنے والا "اقبالیاتی ادب" مختلف النوع اور ہمہ گیر ہے اور کثیر الاطراف بھی، مثلاً: اقبال کی شاعری اور نثر کا متن، تراجم، تشریحات، سوانحی تحقیق، فکر و فلسفے پر تنقید، حوالہ جاتی کام، جامعات میں تحقیق، رسائل و جرائد کے اقبال نمبر اور گوناگوں اقبالیاتی مباحث وغیرہ۔ پچاس برسوں کا جائزہ بھی اقبالیات کے انھی عناوین و دوائر میں مناسب و بامعنی ہو گا۔

۱

اقبالیات کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالنے سے قبل، یہ بتانا ضروری ہے کہ اقبالیات پاکستان کی نصف صدی میں کچھ ایسے اقبالیاتی مصادر منصّۂ شہود پر آئے ہیں جو اقبالیات میں بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مآخذ اس عرصے کی اہم ترین دریافت و بازیافت ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اقبال کی قلمی بیاضیں اور مختلف شعری مجموعوں کے مسودات۔

۲۔ اقبال کی اپنی تحریر میں بعض نثری مسودوں کی بازیافت۔

الف: خطبۂ علی گڑھ: The Muslim Community

ب: اقبال کی موعودہ تصنیف تاریخ تصوف کے چند ابواب۔

ج: ایک انگریزی مضمون بہ عنوان: Bedil, in the light of Bergson

د: ایک ورق بہ عنوان: The Problem of Time in Muslim Philosophy

ہ: اقبال کی نوٹ بک: Stray Reflections

و: سیکڑوں اردو اور انگریزی خطوط، جن میں بڑی تعداد تو مولانا گرامی، چودھری محمد حسین، راغب احسن اور مہاراجا کشن پرشاد کے نام خطوں کی ہے۔ متفرق خطوط بھی خاصی تعداد میں سامنے آئے ہیں۔

اقبالیات میں متذکرہ بالا بنیادی مآخذ کی قدر و قیمت محتاج وضاحت نہیں۔ ان کی بنیاد پر علامہ اقبال کے متداول شعری متون کی تصحیح، متروکات شعری کی مختلف صورتوں کا تعین، اردو اور انگریزی نثر اور خطوط کی اصل نوعیت واضح ہو گئی ہے۔ اب متون اقبال کی تصحیح اور تہذیب و تدوین، نیز ان پر تحقیق زیادہ آسان ہو گئی ہے، اور ان سمتوں میں خطوط پر اقبال شناسوں نے کام کا آغاز کر دیا ہے (ذکر آیندہ اوراق میں آئے گا)۔

مآخذ ہی کے ضمن میں، اس عرصے میں اقبال کی سوانح اور شخصیت سے متعلق بہت سی معاصر روایات فراہم ہوئی ہیں۔ ان میں نذیر نیازی، خواجہ عبدالوحید، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، پروفیسر حمید احمد خاں، م ش، صوفی تبسم اور بعض دیگر بزرگوں کی شہادتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ مزید برآں معاصر اخبارات و رسائل میں مطبوعہ لوازمہ بھی قابل توجہ ہے، خصوصیت سے اقبال کے بیانات اور تقاریر اور ان کی سوانح سے متعلق معلومات، جنھیں زیادہ تر محمد عبداللہ قریشی اور محمد حمزہ فاروقی نے قدیم اخبارات و رسائل سے بازیافت اور مرتب کیا ہے۔

اب ہم شعبہ وار، نصف صدی کی اقبالیاتی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہیں:

۲

علامہ اقبال کی شہرت و مقبولیت کی بنیاد ان کی اردو اور فارسی شاعری پر ہے۔ ان کے شعری مجموعے ہمیشہ ہی "بہترین فروخت" (best seller) کے درجے پر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کی تقطیع، کتابت، اور طباعت و اشاعت کا جو انداز و آہنگ متعین

و مقرر کیا تھا' ایک عرصے تک ان کے تمام شعری مجموعے اسی نہج پر شائع ہوتے رہے' مگر لیتھو کی فرسودہ طباعت زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکی۔ تقریباً ۲۵ برس بعد' ڈاکٹر جاوید اقبال نے غلام رسول مہر کی نگرانی میں محمود اللہ صدیقی سے پورے کلام کی از سرنو کتابت کرائی اور ۱۹۷۳ء میں بڑے اہتمام سے اردو اور فارسی کے الگ الگ مجموعے اور اردو اور فارسی کے کلیات شائع کیے گئے' (شیخ غلام علی ایڈیشن)۔ متن کی متعدد اغلاط' ترتیب و تدوین کی بعض خامیوں' چند ایک ضروری وضاحتی اشارات کی عدم موجودگی اور اشاریوں میں بہت سے نقائص کے باوجود' کلام اقبال کی اشاعت کے ضمن میں' یہ ایک قابل قدر پیش رفت تھی۔ خصوصاً کلیات اردو اور کلیات فارسی کی شکل میں سارے کلام کی یکجا اشاعت' ایک مستحسن اقدام تھا۔[۱]

دوسری بڑی اہم (اور نازک تر) پیش رفت کا آغاز اس وقت ہوا جب ۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء کے بعد سے' کلام اقبال کے "حقوق اشاعت محفوظ" کی پچاس سالہ میعاد پوری ہوئی۔ اب ہر ناشر کلام اقبال چھاپنے میں آزاد تھا۔ اس کا مثبت پہلو تو یہ ہے کہ ناشرین کے درمیان باہمی تجارتی مسابقت کی وجہ سے کلام اقبال کے اردو مجموعے کم قیمت پر دستیاب ہونے لگے۔ اقبال اکادمی نے بھی نئی کتابت میں کلیات اردو کے کئی خوب صورت (ڈی لکس' سپر ڈی لکس اور ارزاں) ایڈیشن شائع کیے۔ سپر ڈی لکس ایڈیشن' نہایت حسین اور دیدہ زیب ہیں اور رشید حسن خاں کے بہ قول: "اس کے صفحات کے حواشی ایسی گل کاری اور رنگ آمیزی سے مزین ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہو"۔[۲] اسلم کمال کا گراں قیمت مصور کلیات بھی چھپا' لیکن اس صورت حال کا ایک منفی پہلو یہ سامنے آیا کہ بعض غیر ذمہ دار ناشرین نے کلام اقبال میں من مانے تحریفات و تصرفات کر ڈالے۔ ایک ناشر[۳] نے تو بڑا ستم ڈھایا۔ بانگ درا کا دیباچہ اڑا دیا' ترتیب کلام بدل ڈالی' ادوار کی حد بندی ختم کر دی' لاپروائی کی انتہا یہ کہ کلام کا کچھ حصہ کلیات اردو سے حذف کر دیا۔[۴]

کیا اقبال کے پاکستان میں کسی "مقتدرۂ اقبالیات" کا قیام ممکن نہیں جو اقبال کا استحصال کرنے والوں کا محاسبہ کرے؟

صحت کے لحاظ سے اقبال اکادمی کا تیار و شائع کردہ نسخہ بہتر ہے۔ اس پر ''اغلاط سے پاک نسخہ'' کے الفاظ درج ہیں، مگر ڈاکٹر صابر کلوروی نے ایک غلطی کی نشان دہی کی ہے۔ ص ۴۳ / ۵۷، آخری سطر: ''فراق آمیز'' درست ہے، نہ ''فراق انگیز''۔ اس نسخے کی کتابت برعظیم کے اکثر قارئین کے لیے مانوس اور دل کش نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں شیخ غلام علی ایڈیشن کی کتابت زیادہ خوب صورت اور نظرافروز ہے۔ اگر اس نسخے کی:

۱۔ اغلاط متن و املا درست کر لی جائیں۔

۲۔ بال جبریل میں غزلیات و قطعات کی اصل ترتیب بحال کر دی جائے۔

۳۔ موجودہ اشاریے کی جگہ ایک نیا اور صحیح اشاریہ شامل کیا جائے۔

تو یہ ایک اچھا، معیاری اور مستند ایڈیشن ہے۔

بازار میں کلام اقبال کے نوع بہ نوع نسخوں اور اشاعتوں کی کمی نہیں، اس کے باوجود، جناب رشید حسن خاں کے بہ قول: ''ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ اقبال کو بہت کچھ ماننے کے باوجود، ان کے کلام کا کوئی تحقیقی ایڈیشن اب تک مرتب نہیں ہو پایا ہے''[۵] اور یہ ایک ایسی کمی ہے جس پر جتنا بھی اظہار افسوس کیا جائے، کم ہے۔

جہاں تک فارسی کلیات کا تعلق ہے، اقبال اکادمی کے نسخے میں جدید ایرانی املا اختیار کیا گیا ہے۔ اس نظام میں غنہ آوازیں نہیں ہیں اور یاے معروف و مجہول اور واو معروف و مجہول کی تفریق بھی ختم ہو گئی ہے۔ صرف معروف آوازیں باقی رہ گئی ہیں۔ اول تو یہ اقبال کے طرز نگارش کے خلاف ہے، دوسرے ایرانی قارئین کے لیے تو یہ نسخہ ٹھیک ہو گا، مگر برعظیم پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے قارئین کے لیے یہ انداز کتابت بہت نامانوس اور اجنبی ہے اور الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہاں شیخ غلام علی ایڈیشن ہی، اغلاط کی تصحیح کے بعد، رائج رہنا چاہیے، اور اردو کلیات کی طرح فارسی کلیات کا بھی ایک تحقیقی ایڈیشن مرتب ہونا ضروری ہے۔

اقبال کے متروک کلام پر ان کی بیاضوں، مسودوں اور دیگر ماخذ کی مدد سے ایک قابل قدر کام ڈاکٹر صابر کلوروی کا ہے۔ (ڈاکٹریٹ کا غیر مطبوعہ مقالہ بہ عنوان: **باقیات شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ**)۔ اب اسی بنیاد پر وہ باقیات کلام اقبال کا

کلیات' مرتب کر رہے ہیں۔

اقبال کے انگریزی خطبات (Reconstruction) ان کی نثر کی مشکل ترین کتاب ہے۔ پروفیسر محمد سعید شیخ نے برسوں کی محنت کے بعد' اسے ایک قابل رشک معیار پر مرتب کیا ہے (۱۹۸۶ء)۔ متن کی صحت' حوالوں کی تلاش و تصحیح' اقتباسات کے تعین و تخریج اور حواشی و تعلیقات کے کام میں انھوں نے جس دیدہ ریزی اور دقت نظر سے کام لیا ہے' ایسی محنت و کاوش اقبال کے کسی اور متن کی تدوین پر نہیں کی گئی۔ یہ ایک معیاری و مثالی تحقیقی ایڈیشن ہے[۶] جسے اقبالیات کے تدوینی کاموں میں نشان راہ بنایا جا سکتا ہے۔

(ایک اور اچھی تدوین' اقبال کے ایک نو دریافت انگریزی مضمون Bedil, in the Light of Bergon کی صورت میں سامنے آئی (۱۹۸۶ء)۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال میوزیم سے اس غیر مطبوعہ مقالے کا دست نوشت مسودہ تلاش کر کے دقت نظر سے اسے پڑھا' پھر متن کو اردو ترجمے' حواشی اور ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ **مطالعہ بیدل' برگساں کی نظر میں** کے نام سے شائع کیا۔[۷] علامہ نے *The Problem of Time in Muslim Philosophy* کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ اس کے معدوم متن کا صرف ایک ہی ورق دستیاب ہوا' اسے بھی ڈاکٹر فراقی نے ترجمہ و توضیحات کے ساتھ مرتب کر دیا۔[۸]) (اقبال کی موعودہ تصنیف **تاریخ تصوف** کے دو ابواب کا مسودہ صابر کلوروی کو دستیاب ہوا' جسے انھوں نے **تاریخ تصوف** کے نام سے بعض حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے'[۹] مگر اپنی اس کاوش پر نظرثانی کرتے ہوئے' اس مسودے کی مزید بہتر تدوین کلوروی صاحب کے پر عزم منصوبوں میں شامل ہے۔) خطبۂ علی گڑھ کا پورا متن دستیاب نہ تھا۔ اسے راقم نے' جاوید منزل سے بازیافت کر کے ۱۹۸۰ء میں اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ پیش کیا۔ اس پر علامہ کا دست نوشت تمہیدی نوٹ' بہ سلسلۂ قادیانیت' خاص اہمیت رکھتا ہے۔[۱۰] علامہ اقبال ۱۹۱۰ء میں ایک نوٹ بک میں بعض اندراجات کرتے رہے جسے انھوں نے *Stray Reflections* کا نام دیا۔ ۱۹۶۴ میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا

کے سلسلے میں یہ نوٹ بک اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال کی مطبوعہ اردو اور انگریزی نثر کے متعدد مجموعے لطیف احمد شروانی' عبدالواحد معینی' محمد عبداللہ قریشی' شاہد حسین رزاقی' رحیم بخش شاہین' محمد رفیق افضل اور زیب النساء نے مرتب کیے ہیں۔ اس نثری ذخیرے کی تحقیقی تدوین باقی ہے۔ اس سمت میں ایک ابتدائی اچھی کوشش اختر النساء کے ایم فل اقبالیات کے تحقیقی مقالے بہ عنوان: **گفتار اقبال: متن کا تحقیقی مطالعہ (۱۹۹۶ء)** میں نظر آتی ہے۔

۱۹۴۷ء تک خطوط اقبال کے دو اردو مجموعے (**اقبال نامہ**' اول: شیخ عطاء اللہ اور **شاد اقبال**: محی الدین قادری زور) شائع ہوئے تھے۔ ایک مختصر' اور گراں قدر انگریزی مجموعہ Letters of Iqbal to Jinnah بھی چھپ چکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد' اس نصف صدی میں خطوطِ اقبال کے ضمن میں بھی خاصا کام ہوا ہے۔ **اقبال نامہ** کا دوسرا حصہ' نیز: نذیر نیازی' خان محمد نیازالدین خاں' مولانا گرامی اور راغب احسن کے نام خطوں کے مجموعے چھپے۔ متفرق مکاتیب کے بعض مجموعے بھی (**انوار اقبال** اور Letters of Iqbal: بشیر احمد ڈار' **خطوط اقبال**: رفیع الدین ہاشمی)۔ محمد عبداللہ قریشی نے **شاد اقبال** کو اضافوں کے ساتھ **اقبال بہ نام شاد** کے نام سے شائع کیا۔ اس عرصے میں سیکڑوں غیرمدوّن (ان میں سے بہت سے غیر مطبوعہ) خطوط دریافت و بازیافت ہو کر سامنے آئے اور ان پر تحقیقی کام بھی ہوا۔ (تدوین کار: افضل حق قرشی' رحیم بخش شاہین' صابر کلوروی' شیخ اعجاز احمد' تحسین فراقی' جہانگیر عالم' اور رفیع الدین ہاشمی وغیرہ)۔

خطوط اقبال میں ایک اہم اضافہ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اور دوسرا ثاقف نفیس نے کیا۔ اقبال کی جرمن ٹیوٹر مس ایما ویگے ناسٹ کے نام' اقبال کے جرمن اور انگریزی خطوط' جرمن نومسلم محمد امان ہوبو ہوم کی تحویل میں تھے جنھیں درانی صاحب بڑی کاوش و محنت سے' اردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ مدون کر کے منصّۂ شہود پر لائے۔ چودھری محمد حسین کے نام غیر مطبوعہ خطوط اقبال کا ایک ذخیرہ' ان کے پوتے ثاقف نفیس نے اپنے ایم اے اردو کے تحقیقی مقالے کے ذریعے منکشف کیا ہے۔[۱۱] اقبال کی شخصیت کی تفہیم کے ضمن میں دونوں ذخیرے بہت اہم ہیں۔ اہمیت کے لحاظ سے وہ خطوط بھی گراں

قدر ہیں، جن کے بعض حصے حذف کر کے شیخ اعجاز احمد نے مظلوم اقبال اور ان کے کچھ اہم اقتباسات جاوید اقبال صاحب نے زندہ رود میں شامل کیے ہیں۔[۱۲]

مکاتیب کی فراہمی و جمع آوری کی متذکرہ بالا کوششوں کے نتیجے میں ۱۵۷۷[۱۳] خطوط سامنے آ چکے ہیں مگر یہ مرحلۂ اول ہے۔ ان خطوں کی تحقیقی تدوین اصل کام ہے۔ اس کے بغیر ذخیرۂ مکاتیب کو جعلی منسوبات (مثلاً: لمعہ حیدر آبادی) سے محفوظ رکھنا مشکل ہو گا۔[۱۴] ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال نامہ اول مدون کر کے تحقیقی تدوین کا عمدہ نمونہ فراہم کیا ہے۔[۱۵]

ایم فل اقبالیات کے تحقیقی مقالات: **مکاتیب اقبال بنام خان نیازالدین خاں، تعلیقات و حواشی** (۱۹۹۳ء) از عبداللہ شاہ ہاشمی، **جہان دیگر: تعلیقات و حواشی** (۱۹۹۷ء) از محمد صدیق ظفر [حجازی] اور **انوار اقبال کے (خطوط) ترتیب و تحشیہ** (۱۹۹۸ء) از زیب النساء کو بھی تدوین کے ضمن میں اچھی پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔

۳

علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے: "میں ذاتی طور پر ترجموں کا قائل نہیں ہوں"۔ ان کے خیال میں ترجمے کے "نہایت مشکل کام" سے عہدہ بر آ ہونا آسان نہیں۔[۱۶] اس کے باوجود بعض نے تو ازراہ عقیدت مندی اور بعض نے بہ طور تجربہ، فارسی کلام کو اردو نظم میں منتقل کیا اور بعض نے اس کے برعکس (عبدالرحمٰن طارق، محمد عبدالرشید فاضل، ایس اے رحمٰن، انعام اللہ خاں ناصر، نظیر لدھیانوی، کوکب شادانی، صوفی تبسم، فیض احمد فیض، حضور احمد سلیم، آفتاب اصغر، عبدالحمید عرفانی، مہر تقوی جے پوری، رفیق خاور، عبدالغفور اظہر، گل بادشاہ، شریف کنجاہی، مسعود قریشی، عبدالعلیم صدیقی، ظہیر احمد صدیقی وغیرہ)۔ علاقائی زبانوں میں ترجمے نسبتاً زیادہ جوش و خروش اور عقیدت مندی کے ساتھ کیے گئے۔

بعض اصحاب نے فارسی اور اردو کلام کے انگریزی ترجمے بھی کیے (عبدالرحمٰن طارق، شیخ عزیز احمد، رفیق خاور، الطاف حسین، صوفی اے کیو نیاز، اکبر علی شاہ، بشیر احمد

ڈار، محمود احمد شیخ، محمد صادق خاں ستی، محمد ہادی حسین، یعقوب مرزا، سعید اختر درانی، ایم اے کے خلیل، جمیل نقوی، خواجہ طارق محمود، سلیم گیلانی، کیو اے کبیر، حسن دین اور مقبول الٰہی) موخر الذکر دو اصحاب کے تراجم بہت عمدہ ہیں۔ ۱۷

کلام اقبال کا پنجابی ترجمہ جیسا اسیر عابد نے کیا (جبریل اڈاری) ویسا ترجمہ کسی اور سے نہیں ہو سکا۔ وہ اردو نظم کو پوری معنویت و مفہوم کے ساتھ پنجابی نظم میں منتقل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ علاقائی زبانوں میں تراجم اقبال مختلف اصحاب کے مرہون منت ہیں۔ (سندھی: لطف اللہ بدوی، محمد بخش واصف--- گجراتی: سید عظیم الدین منادی، خادم کیتانوی--- پشتو: تقویم الحق کاکاخیل، سمندر خاں سمندر، امیر حمزہ شنواری، راحت زا خیلی، عبدالحلیم اثر، شیر محمد۔م نوش--- بنگالی: محمد شہید اللہ، علی احسن، عبدالمنان، میزان الرحمٰن--- پنجابی: عبدالغفور اظہر، خلیل آتش، قریشی احمد حسین قلعداری، شریف کنجاہی، علی احمد گوندل، تنویر بخاری، اسیر عابد--- سرائیکی: مہر عبدالحق، نسیم لیہ، ایاز سہروردی --- بلتی: غشیم بلتستانی--- کشمیری: غلام احمد ناز--- بلوچی: غوث محمد صابر--- براہوی: پیر محمد زبیرانی۔

فارسی کلیات کا مکمل اردو نثری ترجمہ میاں عبدالرشید نے کیا۔ آقا بیدار بخت، الٰہی بخش اعوان، ڈاکٹر الف د نسیم، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، ڈاکٹر محمد ریاض، (بہ اشتراک سعادت سعید) اور طاہر شادانی (بہ اشتراک ضیا احمد ضیا) نے بھی متفرق نثری تراجم کیے۔ بہ ایں ہمہ مکمل فارسی کلام کے ایک عمدہ بامحاورہ نثری ترجمے کی ضرورت ختم نہیں ہوئی۔

اقبال کے انگریزی خطبات کا سب سے معروف اور اولین ترجمہ تو نذیر نیازی کا ہے، بہ عنوان: **تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ** (۱۹۵۸ء) جو بعض اعتراضات کے باوجود اب بھی بہتر ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ شریف کنجاہی نے کیا بہ عنوان: **مذہبی افکار کی تعمیر نو** (۱۹۹۲ء)۔ ڈاکٹر وحید عشرت کا ترجمہ ہنوز کتابی صورت میں طبع نہیں ہوا۔ انگریزی تقاریر و بیانات کا واحد اردو ترجمہ **حرف اقبال** (۱۹۴۵ء) لطیف احمد شیروانی (شاملو) کا ہے۔ چند منتخب انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد ریاض نے بہ عنوان: **افکار اقبال** (۱۹۹۰ء) شائع کیا۔ خطبۂ علی گڑھ کا ایک نیا ترجمہ: **ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ** (۱۹۸۹ء)

از شاہد اقبال کامران۔ Stray Reflections کا بہت عمدہ ترجمہ افتخار احمد صدیقی نے' اور خطوط بنام جناح کا جہانگیر عالم نے کیا۔ ان میں سے بعض تراجم پر نظرثانی کی گنجایش ہے اور نئے تراجم کی ضرورت بھی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

۴

یوسف سلیم چشتی (م: ۱۱ فروری ۱۹۸۴ء) کی معروف حیثیت کلام اقبال کے شرح نگار کی ہے۔ غلام رسول مہر کے سلسلۂ مطالب کے مقابلے میں' ان کی تشریحات مفصل ہیں۔ اس تفصیل و تطویل میں کہیں کہیں وہ موضوع سے ہٹ جاتے ہیں مگر ان کی علمیت اور راست فکری میں کلام نہیں۔ وہ اقبال کے پورے متداول اردو اور فارسی کلام کے شارح ہیں۔ بلاشبہ ان کی شرحوں سے اقبال فہمی کا ایک شعور پیدا ہوا۔ اگر کوئی فہمیدہ اقبال شناس ان کی شرحوں کی تدوین کر سکے تو اپنے موضوع پر آج بھی یہ اچھی شرحیں ہیں۔[۱۸] مہر صاحب' صرف چار مجموعوں کے مطالب قلم بند کر سکے۔ یہ شرحیں مختصر ہیں' مگر ان میں ضروری نکات آگئے ہیں۔[۱۹] کلام اقبال کے دیگر جزوی شرح نگاروں میں نشتر جالندھری' آقاے رازی' عبدالرشید فاضل' ڈاکٹر محمد باقر' صوفی تبسم' عبدالرحمٰن طارق' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' محمد شریف بقا' عارف بٹالوی' عبیداللہ قدسی' اصغر علی شاہ جعفری' ڈاکٹر محمد شفیق' ڈاکٹر الف د نسیم' اسرار زیدی اور فیض لدھیانوی شامل ہیں۔

تشریحات کی ایک نوعیت کلام اقبال کی علامات' تلمیحات اور تراکیب کی توضیح و تصریح بھی ہے۔ اس سلسلے میں عابد علی عابد (تلمیحات اقبال' ۱۹۵۹ء) نسیم امروہوی (فرہنگ اقبال' دو حصے' ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۹ء) مقبول انور داؤدی (مطالب اقبال' ۱۹۸۴ء)' ڈاکٹر اکبر حسین قریشی (مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال' ۱۹۷۰ء' بہ اضافہ ۱۹۸۶ء) کی قابل قدر کاوشیں حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہیں۔

۵

ڈاکٹر سید عبداللہ (م: ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) نے شکوے کے انداز میں لکھا تھا:

"اگر ہم سچ مچ اقبال کو اپنی ذہنی تاریخ میں وہی درجہ دیتے ہیں جو انگریزوں اور جرمنوں نے شیکسپیر اور گوئٹے کو دے رکھا ہے تو ہم ان کے ساتھ اپنی محبت اور ان کے اعتراف کے بارے میں شرمندہ ہونے پر مجبور ہوں گے۔ انگریزی اور مغربی ادب کے واقف کاروں سے وہ طویل و ضخیم اسماء الکتب (Bibliographies) پوشیدہ نہیں ہیں، جن میں شیکسپیر اور گوئٹے کے متعلق کتابیں شامل ہیں۔"[۲۰]

سید صاحب نے یہ بات ۱۹۴۰ء میں کہی تھی لیکن آج ہمیں اس باب میں شرمندگی کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس عرصے میں علامہ اقبال پر خاصا حوالہ جاتی کام ہوا ہے۔ محدود نوعیت کی فہارس کتب اور مضامین (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، جمیل رضوی، معین نواز، اختر النساء، قمر عباس، ندیم شفیق ملک، شازیہ ظہیر خواجہ، نجف علی، حمیرا ظفر) کے علاوہ حوالہ جاتی تحقیق کے سلسلے میں چند عمدہ اشاریے اور جامع کتابیات بھی تیار ہو چکی ہیں۔ تلاش ابیات کے لیے جوے شیر (داؤد عسکر، ۱۹۷۹ء) اشاریہ کلام اقبال، فارسی (زبیدہ بیگم ۱۹۹۶ء) اور کلام اقبال کی تراکیب و الفاظ کے لیے کلید اقبال، اردو (یونس حسرت، ۱۹۸۶ء) مفید اشاریے ہیں۔ اسی طرح خطوط کے لیے اشاریہ مکاتیب اقبال، (صابر کلوروی، ۱۹۸۴ء)۔ اقبال کی تصانیف اور ان پر کتابوں کی توضیحی ببلوگرافی: کتابیات اقبال، (رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۷۷ء) کا نیا ایڈیشن (۱۹۹۸ء تک کے حوالوں کے ساتھ) زیر اشاعت ہے۔ حوالہ جاتی کتابوں میں محمد صدیق کی Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library (۱۹۸۳ء) اور ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی اوزان اقبال (۱۹۸۳ء) بھی اہم ہیں۔ یونی ورسٹیوں کے تحقیقی مقالات کی شکل میں بھی بعض علمی مجلّوں (اقبال، اقبال ریویو، نقوش، اورینٹل کالج میگزین) میں شائع شدہ لوازمہ اقبالیات کی فہارس تیار ہوئی ہیں۔ اقبال اور اقبالیات سے متعلق شخصیات پر دو کتابیں: رجال اقبال (عبدالرؤف عروج، ۱۹۸۸ء) اور معاصرین اقبال (فیوض الرحمٰن، ۱۹۹۳ء) مفید معلومات فراہم کرتی ہیں، البتہ اقبال انسائی کلوپیڈیا کی تیاری پر کسی اقبالیاتی ادارے نے توجہ نہیں دی۔ ملک حسن اختر (م: ۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء) کی انفرادی کوشش (دائرہ معارف اقبال، ۱۹۷۷ء) معیار سے فروتر رہی۔

اقبالیاتی ادب میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے، اس کے تجزیے کی ضرورت

محسوس ہونے لگی۔ مطالعہ اقبال کی ابتدائی کاوشوں اور اس ضمن میں مزید تحقیقی و تنقیدی کاموں کی ضرورت اور اہم موضوعات اور "مہمات امور" کی نشان دہی سب سے پہلے "کلام اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت" ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ معارف اعظم گڑھ (مارچ ۱۹۴۴ء) میں کی۔ کتابی صورت میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی **اقبالیات کا تنقیدی جائزہ** (۱۹۵۵ء) اس سلسلے کی اولین علمی کاوش تھی۔ ۱۹۶۶ء میں مشفق خواجہ نے اپنے مضمون "اقبال پرستی سے اقبال شناسی تک" میں توجہ دلائی کہ اقبالیات کی بعض خاص سمتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔[۲۱] پھر راقم الحروف نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پہلے تو چند ایک مضامین لکھے،[۲۲] بعدازاں باقاعدہ سالانہ اقبالیاتی جائزے مرتب کرنا شروع کیے مگر **۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب**، (۱۹۸۶ء) **۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب**، (۱۹۸۸ء) **اقبالیاتی جائزے** (۱۹۹۰ء) اور **اقبالیاتی ادب کے تین سال: ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء** (۱۹۹۳ء) کے بعد یہ سلسلہ اب تعطل کا شکار ہے، البتہ ۱۹۹۸ء کا جائزہ شائع ہوا ہے۔[۲۳] اس نوع کے جائزے حوالے کا کام دیتے ہیں، ان سے اقبالیات کے مختلف رجحانات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کن شعبوں میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایک مبسوط جائزہ بہ عنوان: "جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید" (۱۹۸۴ء) بھی لائق مطالعہ ہے۔[۲۴]

۶

بہ اعتبار موضوع سوانحی کتابیں، اقبالیاتی ادب میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ بزم اقبال لاہور نے ابتدا میں اقبال کی سوانح عمری لکھنے کا کام غلام رسول مہر(م: ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) کو سونپا، جو اس وقت اس علمی خدمت کے لیے موزوں ترین سکالر تھے، پھر یہ کام عبدالمجید سالک (م ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کی کاوش **ذکر اقبال** (۱۹۵۵ء) قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والی علامہ اقبال کی پہلی باضابطہ سوانح عمری ہے۔ سالک مرحوم کو اقبال کی صحبت و رفاقت حاصل رہی اور انھیں اس موضوع پر بہت سا ضروری لوازمہ

بھی میسر تھا۔ ذکر اقبال ایک معلومات افزا کتاب ضرور ہے، مگر مصنف کے مخصوص مزاج، بعض ذاتی معتقدات، صحافیانہ افتادِ طبع، ضروری تحقیق و تفحص میں کمی اور عدم احتیاط کے سبب اسے ایک معیاری سوانح عمری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں تاریخی اور واقعاتی غلطیاں ہیں اور "اقبال کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کے درمیان ربط کا فقدان ہے۔ کتاب ایک کل نہیں، بلکہ الگ الگ ٹکڑوں میں بٹی نظر آتی ہے، نتیجہ یہ کہ کتاب کو پڑھ کر اقبال کی شخصیت کا کوئی نقش نہیں بنتا"۔[۲۵]

آیندہ بیس برسوں میں، اقبالیاتی ادب کے اس اہم شعبے یعنی سوانح اقبال کے ضمن میں، ایک سناٹے کی کیفیت طاری رہی۔ اقبال صدی (۱۹۷۷ء) کے موقع پر اقبال کی ایک معیاری اور مستند سوانح عمری کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت اقبال نے اس مسئلے پر غور کیا اور یہ ذمہ داری سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو سونپی۔ موخر الذکر کی سرگذشت اقبال (۱۹۷۷ء) میں، بہ قول ایس اے رحمٰن: "حیات اقبال کے ضروری کوائف اجاگر ہو گئے"۔ (دیباچہ) مگر یہ بہت عجلت میں لکھی گئی تھی اس لیے، اس کے بعض حصوں کی مناسب طور پر تسوید نہ ہو سکی، بعض امور تشنہ رہ گئے اور اس میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئیں۔ سیاست دان اقبال تو نظر آتا ہے مگر شاعر اقبال اور خواب دیکھنے والا اقبال سرگذشت اقبال میں غائب ہے۔ مزید برآں اس میں اقبال کی شخصیت اور فن کا پہلو بہت کمزور ہے اور یہ محض اقبال کے خارج کا کوائف نامہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر خورشید ذکر اقبال کے سحر سے آزاد ہو کر قلم اٹھاتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ تاہم ان کی کاوش سے علامہ اقبال کے سوانحی ذخیرے میں کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہوئی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے سرگذشت اقبال پر ایک سخت محاکمہ تحریر کیا۔[۲۶]

سید نذیر نیازی کی دانائے راز (۱۹۷۹ء) ۱۹۰۸ء تک کے حالات پر محیط ہے۔ اس کے بعض ابواب بہت معلومات افزا اور عمدہ ہیں، جیسے: نوجوان اقبال، ازدواج، پہلی شادی، تشکیلی دور کی بحث بھی مربوط اور مفصل ہے۔ ازدواجی اختلاف ایسے نازک موضوع کو مصنف نے اس متوازن انداز میں سمیٹا ہے کہ اس سے پہلے اقبال کے کسی سوانح نگار سے

ایسا ممکن نہ ہوا۔ لیکن اس کتاب کو مناسب تدوین، ابواب بندی اور حوالوں کی تکمیل کے بعد ہی شائع ہونا چاہیے تھا۔

متذکرہ بالا دونوں کتابوں کے مقابلے میں محمد حنیف شاہد کی **مفکر پاکستان** (۱۹۸۲ء) زیادہ ضخیم اور مفصل ہے۔ اس کی جامعیت، مصنف کی محنت و کاوش، تلاش و جستجو اور لوازمے و مسالے کی کثرت قاری کو متاثر بلکہ مرعوب کرتی ہے۔ مصنف نے انجمن حمایت اسلام کی قلمی رودادوں اور پنجاب گزٹ سے غالباً پہلی بار مدد لی ہے۔ معلومات کی فراوانی، اقتباسات کی کثرت اور کوائف کی ثروت کے لحاظ سے بلاشبہ یہ ایک پُراز معلومات کتاب ہے، مگر ایک تو جابجا مصنف کا اِدعا بہت کھلتا ہے، دوسرے: مصنف نے رطب و یابس میں تمیز و تفریق کیے بغیر، جواہر کو خزف ریزوں کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ مواد کی ترتیب و تدوین اور تنظیم ڈھنگ سے نہیں ہو سکی۔ مزید برآں حوالوں کا نظام ابتر اور بے قاعدہ ہے اور تحلیل و تجزیے اور نقد و انتقاد کی بھی شدید کمی ہے۔ ان وجوہ سے **مفکر پاکستان** میں قاری کے لیے دل کشی کم ہے۔

اسی زمانے میں ایم ایس ناز کی حیات اقبال اور صابر کلوروی کی یاد اقبال بھی شائع ہوئیں، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال (پ: ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء) کی زندہ رود (اول ۱۹۷۹ء، دوم ۱۹۸۱ء، سوم ۱۹۸۴ء) اقبال کی جملہ سوانح عمریوں میں برتر اور فائق ہے۔ اس میں اقبال کی **شخصیت** کے جملہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و شعری اور سیاسی کارناموں کا جامعیت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ نجی زندگی سے متعلق بعض بنیادی مآخذ اور بعض نادر دستاویزات و شواہد مصنف کی دسترس میں تھے۔ اپنی نسبی حیثیت کی وجہ سے حیات اقبال کے بعض امور پر بلاخوفِ لومَۃَ لائم کچھ لکھنا جاوید صاحب کے لیے خاصا مشکل تھا، مگر اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک سوانح نگار کی ذمہ داریوں سے انحراف نہیں کیا، چنانچہ زندہ رود میں ہمیں معروضیت اور توازن نظر آتا ہے۔ یہاں حیات اقبال کے اہم کوائف و حقائق اور واقعات پورے پس منظر و پیش منظر اور تفصیلات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہ حکایت طویل ضرور ہے، مگر اس کی لذت میں کلام نہیں۔ زندہ رود اقبال کی دماغی و ذہنی سرگذشت ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی زندگی، ایک بڑے آدمی

اور ایک عظیم انسان کی زندگی تھی۔ بلاشبہ زندہ رود اقبال کی سوانح عمریوں میں سب سے بہتر اور جامع ہے، مگر حرف آخر نہیں۔[۲۷] اسے "قومی صدارتی اقبال اوارڈ" دیا گیا۔ اس اثنا میں، حیات اقبال کے بارے میں جو نیا لوازمہ سامنے آیا ہے (اور یہ سلسلہ جاری ہے) اس کی روشنی میں زندہ رود پر نظرثانی اور اضافوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بعض کتابوں کو اقبال کی "جزوی سوانح" کہہ سکتے ہیں، جیسے: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کی اقبال کی ابتدائی زندگی (۱۹۸۶ء) یا ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی عروج اقبال (۱۹۸۷ء)۔ موخر الذکر میں ۱۹۰۸ء تک اختصار و جامعیت سے حیات اقبال کے ضروری کوائف دیے گئے ہیں اور اقبال کا ذہنی و فکری اور شاعرانہ ارتقا بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ اقبال کی ہشت پہلو شخصیت اور ان کے قلب و دماغ اور ذہن و فکر کا ایک عمدہ اور مربوط مطالعہ ہے۔ مصنف کے توازن فکر و نظر کے علاوہ عروج اقبال کی خاص بات مصنف کا دل کش ادبی اور تنقیدی اسلوب ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر "قومی صدارتی اقبال اوارڈ" کی مستحق قرار پائی۔

اقبال کی زندگی، شخصیت، ان سے ملاقاتوں کی یادداشتوں اور ان کے ملفوظات پر مشتمل کتابیں بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں۔ ایسی مختلف النوع کتابوں کو اقبال کے سوانحی ذخیرے میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اقبال کے سوانح نگار کے لیے ان کی حیثیت ایک ناگزیر لوازمے اور مسالے کی ہے، جیسے: فقیر سید وحیدالدین کی روزگار فقیر (اول ۱۹۵۰ء، دوم ۱۹۶۴ء) سید حامد جلالی کی علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی (۱۹۶۷ء، طبع دوم ۱۹۹۶ء) سید نذیر نیازی کی اقبال کے حضور (۱۹۷۱ء)، خالد نظیر صوفی کی اقبال درون خانہ (۱۹۷۱ء)، صہبا لکھنوی کی اقبال اور بھوپال (۱۹۷۳ء)، محمد حمزہ فاروقی کی سفرنامہ اقبال (۱۹۷۳ء)، ڈاکٹر نظیر صوفی کی حیات و پیام علامہ اقبال (۱۹۷۹ء)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے (۱۹۸۸ء) اور اقبال کا سیاسی سفر (۱۹۹۲ء)، رحیم بخش شاہین کی اوراق گم گشتہ (۱۹۷۵ء) اور Mementos of Iqbal (۱۹۷۵ء)، محمد حنیف شاہد کی اقبال اور انجمن حمایت اسلام (۱۹۷۶ء)، علامہ اقبال اور پنجاب کونسل (۱۹۷۷ء)، محمد عبداللہ چغتائی کی اقبال کی صحبت میں (۱۹۷۷ء) اور روایات اقبال (۱۹۷۷ء)، غلام

رسول عدیم اور محمد رفیق کی مشترکہ کاوش مزار اقبال (۱۹۸۲ء)' محمد عبداللہ قریشی کی حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں (۱۹۸۲ء)' اعجاز احمد کی مظلوم اقبال (۱۹۸۵ء)' صابر کلوروی کی مرتبہ اقبال کے ہم نشین (۱۹۸۵ء)' ڈورس احمد کی Iqbal, As I Knew Him (۱۹۸۶ء)۔

اس نوع کی کتابوں میں غلام رسول مہر کا مجموعۂ مضامین اقبالیات اہم ہے۔ مہر صاحب ایک زمانے میں اقبال کی سوانح عمری لکھنے کا عزم رکھتے تھے' جو بہ وجوہ بروے کار نہ آ سکا۔[۲۸] ان کے یہ مضامین ہی بسا غنیمت ہیں۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی دو کتابیں: اقبال یورپ میں (۱۹۸۴ء' بہ اضافہ ۱۹۹۹ء) اور نوادر اقبال: یورپ میں (۱۹۹۵ء) حیات اقبال کے متعدد نئے گوشے سامنے لاتی ہیں' مثلاً: برطانیہ اور جرمنی میں اقبال کے مختلف تعلیمی مراحل سے متعلق نئی معلومات' خطوط اور نادر دستاویزات' برطانیہ کے کتب خانوں میں موجود تصانیف اقبال کے بعض نسخوں پر اقبال کی دست نوشت انتسابی تحریریں' ٹرنٹی کالج کیمبرج' لنکنز اِن اور میونخ یونی ورسٹی کے داخلہ رجسٹروں میں درج اقبال کے بعض اہم کوائف' ممتحنوں کے پینل اور ان کی رپورٹیں' اسی طرح جرمنی اور انگلستان میں اقبال کی قیام گاہوں پر انتسابی تختیوں کی تنصیب' کیمبرج میں اقبال چیر کے قیام کے ضمن میں درانی صاحب کی کاوشیں' اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے اصل مسودے کی دریافت اور مطبوعہ کتاب سے اس کا تقابل' ویگے ناسٹ کے نام جرمن اور انگریزی میں اقبال کے اہم اور قیمتی خطوط کی دریافت وغیرہ۔ اقبال کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کیمبرج میں بی اے کے لیے جو تحقیقی مقالہ لکھا' وہ اس قدر معیاری اور بلند پایہ تھا کہ اس میں معمولی ترامیم کے بعد' میونخ یونی ورسٹی نے انھیں اسی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی۔

بعض اقبال شناس محققین نے اقبال کے سوانحی ذخیرے پر چند اہم مضامین کے ذریعے قابل قدر اضافے کیے ہیں' مثلاً: ڈاکٹر وحید قریشی (علامہ اقبال کی زندگی کی بعض تفصیلات' علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج)' ڈاکٹر محمد باقر (اقبال کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ)' صفدر محمود (علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی)۔ ملک حسن اختر نے پنجاب گزٹ کے حوالے سے اقبال

کی تعلیمی زندگی سے متعلق مفید معلومات مہیا کی ہیں۔[۲۹] نقوش اقبال نمبر۱، ۲ (ستمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء) میں چند اہم سوانحی مضامین شامل ہیں: اقبال کے حضور از خواجہ عبدالوحید، اقبال کا قیام لاہور از حکیم احمد شجاع، ایک انٹرویو بہ سلسلہ اقبال از میاں عبدالعزیز مالواڈہ، اقبال بہ حیثیت ممتحن از محمد حنیف شاہد، وغیرہ۔

اقبال پر سوانحی ذخیرے میں بعض مباحث بھی اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً:

تاریخ ولادت کا مسئلہ قیام پاکستان کے بعد ربع صدی تک بھی محقق نہ ہو سکا۔ زیادہ قرائن ۱۸۷۳ء کے حق میں تھے، مگر حکومت پاکستان ۱۹۷۳ء تک تاریخ ولادت کا تعین ہی نہ کر سکی تھی اس لیے سرکاری طور پر ۱۸۷۷ء کو اقبال کا سال ولادت قرار دے کر ۱۹۷۷ء کو اقبال صدی کے طور پر منایا گیا۔ تاریخ ولادت کی بحث اس کے بعد بھی جاری رہی۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت (مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، زاہد منیر عامر، ۱۹۹۴ء) میں اس موضوع پر مطبوعہ منتخب مضامین یک جا کیے گئے ہیں اور ان پر حواشی کا اضافہ بھی ہے، مگر صحیح تاریخ ولادت کیا ہے؟ مقدمے میں زاہد منیر عامر نے اس کا فیصلہ معزز قاری اور مستقبل کے مورخ پر چھوڑ دیا ہے۔

بعض اصحاب نے اقبال کی شخصیت کا مطالعہ، جدید نفسیات کی روشنی میں کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد عثمان کا مضمون "حیات اقبال کا ایک جذباتی دور" (۱۹۵۷ء)[۳۰] خاصا متوازن تھا۔ بیس برس بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے علم نفسیات و تاویلات کے ذریعے اقبال کے قیام یورپ اور مابعد کے ۵، ۷ سالوں کا ایک "مزے دار" منظرنامہ تیار کیا، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، (۱۹۷۷ء)۔[۳۱] انھوں نے تحلیل نفسی کی مدد سے اقبال کی شخصیت کے تاریک نہاں خانوں میں جھانکا اور "غوطہ لگا کر آئس برگ کی حقیقت کو جاننے کی جرأت" کی۔ اس "تفتیش" کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ اقبال اور عطیہ بیگم کے درمیان "تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟" نفسیاتی نقاد کو کسی قدر مایوسی ہوئی کیوں کہ خطوط غالب کی طرح، خطوط اقبال میں اقبال کا "ارتکاب جرم" ثابت کرنے کے لیے انھیں "ڈھنگ کے حوالے" بھی نہیں مل سکے، وہ کہتے ہیں: "اس ضمن میں صرف قیاسات سے ہی کام لیا جا سکتا ہے"۔ چنانچہ علم نفسیات یا قیاسات کے ذریعے وہ ایک "تار

عنکبوت" تیار کرتے ہیں اور تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اقبال عطیہ سے کسی "انعام" کے متمنی تھے۔ جناب نعیم صدیقی نے سوال اٹھایا کہ فاضل نقاد کیا اپنے والدین کا نفسیاتی تجزیہ کرنا بھی پسند کریں گے؟ پھر تمام بزرگان ملت' اولیا اور اتقیا کا نفسیاتی تجزیہ مناسب رہے گا؟ ان کے خیال میں یہ محض ایک مریضانہ ذہنیت کی کارفرمائی ہے اور اس کے ڈانڈے ترقی پسندوں کی تحریک انہدام اقبال سے ملتے ہیں۔ [۳۲] شرفا' اپنے مرحومین کا پوسٹ مارٹم پسند نہیں کرتے۔

بجا ہے کہ اقبال لاہور کے "گھٹن کے ماحول" سے نکل کر' یورپ کی آزاد اور رنگین فضا میں پہنچے تو وہ ایک عرصے تک اندرونی کش مکش میں مبتلا رہے' (اندرونم جنگ بے خیل و سپاہ) مگر صدیقی صاحب کہتے ہیں: "اقبال یورپ کی آزاد فضاؤں سے جس پاکیزگی کے ساتھ گزرا ہے' وہ بڑا قابل فخر جوہر سیرت ہے' بلکہ اگر آپ ثابت کر دیں کہ اس کے اندر کوئی جنسی داعیہ کام کر رہا تھا تو اس داعیے کے حملے سے جس خوبی سے بچ کر اقبال نکلا ہے' کوئی مہاتپسی بھی اس طرح نہ نکل سکے گا۔ یہی ضبط نفس اور ایثار ذات ہے جس نے اس کی شخصیت اور اس کی فکر اور اس کے فن کو بے حد بالیدگی دی"۔ [۳۳]

یہی نتیجہ پروفیسر محمد عثمان نے اخذ کیا کہ اس سارے قصے کا "انجام بصیرت افزا اور نظر افروز ثابت ہوا اور اس کی بدولت اردو شاعری کو فکر و جذبے کی وہ ندرت اور ثروت نصیب ہوئی جو اسے میر و غالب کے ہاتھوں کبھی میسر نہ آ سکتی تھی"۔ [۳۴]

اس باب میں ایک غور طلب امر یہ ہے کہ اقبال کے نفسیاتی تجزیوں میں زیادہ تر عطیہ بیگم کے بیانات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ عطیہ کی کتاب میں' بلاشبہ اقبال کی شخصیت کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں' مگر اس کے تمام بیانات کو جوں کا توں قبول کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے خیال میں ان کے بعض بیانات میں تضاد ہے اور کتاب میں عطیہ کا "جذبہ خودنمائی" جھلکتا ہے۔ "محلوں کی ناز پروردہ' تفریحات و تعیشیات کی دل دادہ" اور "سطحی خیالات اور تفریحی رجحانات" رکھنے والی عطیہ اور اقبال جیسے درویش مزاج اور پرخلوص شخص کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا' بلکہ صدیقی صاحب نے طویل تجزیے (عروج اقبال' ص ۳۲۱ تا ۳۲۸) کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عطیہ کے

بعض ”بیانات“ دراصل خود ان کے شکست پندار کی دلیل ہیں“۔ سعید اختر درانی نے بھی عطیہ بیگم کے بیانات کو ”مبالغہ آمیز“ قرار دیا ہے (اقبال‘ یورپ میں طبع دوم‘ ص ۲۶۴) سو‘ یہ قرین انصاف نہ ہو گا کہ اقبال کے نفسیاتی تجزیوں کی بنیادیں‘ عطیہ بیگم کے بیانات پر استوار کی جائیں۔

۷

اقبالیاتی ادب کا غالب حصہ‘ حضرت علامہ کے فکر و فلسفے کی تشریح و تعبیر اور تنقید و تجزیے پر مشتمل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی زمانے میں اس نوعیت کی کتابوں میں سے محمد احمد خاں کی **اقبال کا سیاسی کارنامہ** (۱۹۵۲ء)‘ خلیفہ عبدالحکیم کی **فکر اقبال** (۱۹۵۷ء)‘ عابد علی عابد کی **شعر اقبال** (۱۹۶۴ء) اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی **مقامات اقبال** (۱۹۵۹ء) نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ **فکر اقبال** اپنی بعض خامیوں کے باوجود مقبول ہوئی کیونکہ ایک تو مصنف کا نام اہم تھا‘ دوسرے: اس وقت ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس میں اقبال کے تمام اہم نظریات کی یک جا اور ایسی جامع تشریح ملتی ہو‘ اس لیے طالب علموں کے حلقوں میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ تیسرے: ایک سرکاری ادارے (بزم اقبال) سے اس کی اشاعت کی وجہ سے اس کی استنادی حیثیت کو تقویت ملی۔ بلاشبہ اس میں علامہ کے بیش تر افکار و تصورات پر دل کش اسلوب اور عمدہ تنقیدی زبان میں جامع تبصرہ ملتا ہے‘ مگر اس میں بعض خامیاں بھی ہیں۔ بڑی خامی تو مصنف کے ذہن میں ہے۔ **فکر اقبال** میں کئی مقامات پر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں مصنف کا ذہن صاف نہ تھا۔ انھیں شبہ تھا کہ عصر حاضر میں اسلام ایک زندہ و توانا نظریہ اور ایک انقلابی قوت بن سکتا ہے۔ مرحوم خلیفہ صاحب مغرب سے مرعوبیت کا شکار تھے اس لیے انھیں‘ عقل پر اقبال کی تنقید اچھی نہیں لگتی۔ اسی طرح کہیں وہ اسلام اور اقبال سے اشتراکیت برآمد کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں‘ تاہم **فکر اقبال** کا آخری باب (نمبر ۲۰‘ خلاصہ افکار) جامع ہے اور اس میں توازن بھی ہے۔ خلیفہ صاحب کے ایک مداح پروفیسر محمد عثمان نے **فکر اقبال** کو مایوس کن قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خلیفہ مرحوم نے بہت سی مفید باتیں خاصے دل چسپ انداز میں بیان کی ہیں، مگر جہاں تک محققانہ دقت نظر، احتیاط پسندی اور حقائق کو جزئیات کے ساتھ تمام و کمال دیکھنے دکھانے کی کوشش کا تعلق ہے، فکر اقبال ہر جگہ اور ہر باب میں اپنے تشنہ اور ناکام ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے"۔ ۳۵

راقم کا پختہ عقیدہ ہے کہ جو شخص صدق دل سے فکر اقبال سے متفق نہ ہو، وہ روایتی اور پیشہ ور اقبال شناس تو بن سکتا ہے، اقبال کا اچھا نقاد یا شارح نہیں ہو سکتا۔ جو بات دل سے نہ نکلے، اس میں تاثیر کہاں؟

عابد علی عابد (م: ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء) نے شعر اقبال میں شاعر کے "شعور تخلیق کا جائزہ" لیتے ہوئے فنی رموز و علائم، صنائع و بدائع اور محسنات شعر کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلا مبسوط اور مربوط مطالعہ ہے۔ مگر مصنف کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ اس [عطیہ فیضی] ذہین اور طرار خاتون کی رفاقت نے اقبال کی تخلیقی کاوشوں کو متاثر کیا (ص ۲۳۲)۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عطیہ فیضی سطحی اور تفریحی ذہنیت رکھتی تھیں اور ان کے بعض بیانات خلاف حقیقت ہیں۔ بعدازاں کچھ دیگر ناقدین نے بھی "شاعر اقبال" کے کمال فن کو نمایاں کیا (جابر علی سید، افتخار احمد صدیقی، پروفیسر نذیر احمد، سعداللہ کلیم، تبسم کاشمیری وغیرہ)۔ ۳۶ اس کے باوجود شعر اقبال کے فنی تجزیے کا پہلو اور اقبال بہ حیثیت شاعر کا موضوع، فکر و فلسفے پر تنقید کے مقابلے میں دبا ہی رہا ہے۔ پاکستان میں اقبالیاتی ادب کا معتدبہ حصہ اقبال کی پیغمبرانہ، مجددانہ اور مفکرانہ حیثیت پر مشتمل ہے، حالانکہ ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی فکری اہمیت سے فروتر نہیں ہے۔ اقبال کی بلند پایہ شاعری ہی نے، ان کے فکر و فلسفے میں جاذبیت، تاثیر اور ندرت پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا فاضل معلم اور زیرک نقاد مسلسل ۴۵ برس تک اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو منور کرتا رہا۔ اقبال پر ان کی تصانیف: مسائل اقبال (۱۹۷۴ء)، مقاصد اقبال (۱۹۸۱ء)، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ (۱۹۸۴ء) اور درجنوں مضامین، اقبالیات پر ان کی عمیق علمی نظر اور ان کے برسوں کے غور و خوض اور تدبر و تفکر کا ماحصل ہیں۔ انھوں نے فلسفہ اقبال کے مشکل اور ادق نکات کو بھی سہل بنا کر پیش

کیا ہے۔ وہ فکر اقبال کو ایک علمی، فکری اور نظریاتی تحریک بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ اقبال کے سیاسی افکار و تصورات پر محمد احمد خاں کی متذکرہ بالا اقبال کا سیاسی کارنامہ (نظرثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن، ۱۹۷۷ء) کے بعد اس پہلو پر ڈاکٹر جاوید اقبال (مے لالہ فام، ۱۹۶۶ء)، عاشق حسین بٹالوی (اقبال کے آخری دو سال، ۱۹۶۱ء)، نعیم صدیقی (اقبال اور نظریہ پاکستان، ۱۹۶۳ء)، پروین شوکت علی (The Political Philosophy of Iqbal، ۱۹۷۰ء) اور بعض دیگر مصنفین نے بھی اچھی بحث کی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (م: ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء) چوٹی کے اقبال سکالر اور اقبال اکادمی پاکستان کے بانی ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے اقبال ریویو کے ذریعے مطالعہ فکر اقبال کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کی کتاب اقبال کا فلسفہ خودی اس موضوع پر پہلا عالمانہ اور فلسفیانہ مربوط مطالعہ ہے۔ ممتاز حسن (م: ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء) اور بشیر احمد ڈار، (م: ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء) اقبالیات پاکستان کے معماروں میں سے تھے۔ وہ علی الترتیب نائب صدر اور ڈائرکٹر اقبال اکادمی رہے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا، لکھوایا، منصوبے تیار کیے اور اقبالیات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، خصوصاً ڈار صاحب نے اردو اور انگریزی میں قابل قدر تنقیدی اور تدوینی کام انجام دیے:

Iqbal and Post - Kantian Voluntarism (۱۹۵۶ء)،

انوار اقبال (۱۹۶۷ء)، A Study in Iqbal's Philosophy (طبع دوم ۱۹۷۱ء)،

Letters of Iqbal (۱۹۷۷ء)،

Articles on Iqbal (۱۹۷۷ء)۔

اول الذکر پر انھیں "قومی صدارتی اقبال ایوارڈ" دیا گیا۔ اقبال اور عبدالحق، ممتاز حسن مرحوم کا نمونے کا کام ہے۔ اسی طرح محمد عبداللہ قریشی (م: ۱۲ اگست ۱۹۹۴ء) نے ترتیب و تدوین کے شعبے میں بعض مفید اور قابل قدر کام کیے۔ (مکاتیب اقبال بہ نام گرامی ۱۹۶۹ء، اقبال بہ نام شاد ۱۹۸۵ء، حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں ۱۹۸۲ء، حیات جاوداں ۱۹۸۷ء، تذکار اقبال ۱۹۸۸ء۔ ڈاکٹر محمد ریاض (م: ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء) نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کا شعبۂ اقبالیات منظم کیا اور اقبالیات پر مضامین نو کے انبار

لگا دیے۔ ان کے ہاں پھیلاو بہت زیادہ ہے اور عمق نسبتاً کم۔ تقریباً ایک درجن تنقیدی مجموعوں کے علاوہ انھوں نے این میری شمل کی Gabriel's Wing کا اردو اور اقبال کی ڈائری Stray Reflections کا فارسی ترجمہ کیا۔ فارسی میں کتاب **شناسی اقبال** بھی مرتب کی۔[۳۷] ان کی مجموعی اقبالیاتی خدمات قابل قدر ہیں۔

محمد رفیق خاور (م: ۱۵ مئی ۱۹۹۰ء) نے اقبالیاتی ادب میں وقیع اضافہ کیا۔ اقبال کی شاعری کے اردو، انگریزی اور فارسی تراجم کے علاوہ، انھوں نے اقبالیاتی تنقید بھی لکھی اور **اقبال کا فارسی کلام** (۱۹۸۸ء) پر "قومی صدارتی اقبال اوارڈ" حاصل کیا۔

پروفیسر محمد منور (پ: ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء) اقبالیات کے مفسر، شارح اور نقاد ہیں۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کے صدر، اقبال اکادمی کے ناظم اور سالہا سال تک مرکزیہ مجلس اقبال کے کلیدی مقرر کی حیثیت سے فروغ اقبالیات کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بارہا بیرون ملک اقبالیاتی دورے بھی کیے۔ ان کی تصانیف نے قارئین میں فکر اقبال کا فہم و شعور پیدا کیا۔ (تصانیف: **میزان اقبال** (۱۹۷۲ء)، **ایقان اقبال** (۱۹۷۷ء)، **اقبال کی فارسی غزل** (۱۹۷۷ء) *Iqbal and Quranic Wisdom* (۱۹۸۱ء)، **برہان اقبال** ۱۹۸۲ء، *Dimensions of Iqbal* (۱۹۸۶ء)، *Iqbal: The Poet Philosopher of Islam* ۱۹۸۲ء، **قرطاس اقبال**، ۱۹۸۸ء۔

بہ قول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: "پروفیسر صاحب کو اللہ پاک نے "آہِ سحر" اور "نورِ بصیرت" دونوں سے نوازا ہے۔ اس لیے وہ صحیح مسلمان فاضل کی طرح اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں"۔ (دیباچہ: برہان اقبال)۔

اقبالیاتی خدمات ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی (پ: ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء) کا نام بھی اہم ہے۔ وہ ایک عرصے تک بزم اقبال لاہور اور اقبال اکادمی کے ناظم اور ان اداروں کے تحقیقی مجلات کے مدیر رہے۔ ان کی تحریک و تشویق پر بہت سی مفید کتابیں مرتب و شائع ہوئیں۔ ان کے تنقیدی مضامین **اساسیاتِ اقبال** (۱۹۹۶ء) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "اقبال اور اسلامیہ کالج" اور "اقبال اور اورینٹل کالج" جیسے اور اسی طرح کے دیگر وقیع تحقیقی مقالات پر مشتمل، ان کا موعودہ مجموعہ ہنوز تشنۂ طباعت ہے۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (م: ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء) نے (بہ طور استاد و صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد) اقبالیات کے مختلف موضوعات پر ایم فل کے بیسیوں تحقیقی مقالات کی نگرانی و راہ نمائی کی۔ متعدد کتابیں: **اوراق گم گشتہ** (۱۹۷۵ء)، *Mementos of Iqbal* (۱۹۷۵ء)، **اقبال کے معاشی نظریات** (۱۹۷۶ء)، **ارمغان اقبال** (۱۹۹۱ء) پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ بہ عنوان: **مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ** (۱۹۸۷ء) اور بیسیوں غیرمدون تحقیقی و تنقیدی مقالات ان سے یادگار ہیں۔[۳۸]

ڈاکٹر صدیق جاوید (پ: ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء) نے سوانحی اور تنقیدی پہلوؤں پر مفید کام کیا ہے۔ **بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ** (۱۹۸۷ء)، **اقبال پر تحقیقی مقالے** (۱۹۸۸ء) اور **اقبال کا عمرانی مطالعہ** (۱۹۸۹ء)۔ ڈاکٹر تحسین فراقی (پ: ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء) کی بعض کاوشوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں آ چکا ہے۔ **جہات اقبال** (۱۹۹۳ء) کے بعد، انھوں نے نئے مجموعۂ مضامین **اقبال: چند نئے مباحث** (۱۹۹۸ء) پر اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے تحقیق و تنقید کا "وزیراعظم ادبی انعام" حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر صابر کلوروی (پ: ۳۱ اگست ۱۹۵۰ء) اگرچہ اقبال کے مکاتیب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، مگر **باقیات کلام** پر انھیں تخصص حاصل ہے۔

اقبال کے نقاد اور تجزیہ نگار بعض مخصوص موضوعات کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں، جیسے: تصوف اقبال (شاہ عبدالغنی نیازی، ابو سعید نورالدین، پروفیسر محمد فرمان، محمد شریف بقا، ابواللیث صدیقی، بشیر مخفی القادری، الف د نسیم) یا اقبال کے تعلیمی نظریات (محمد احمد خاں، محمد احمد صدیقی، بختیار حسین صدیقی، محمد فاروق جوبش) بعض اصحاب نے اقبال کو اشتراکی عینک سے دیکھا (محمد حنیف رامے، صفدر میر، ثاقب رزمی، ریاض صدیقی وغیرہ)۔

مختلف موضوعات پر مقالات و مضامین کے بیسیوں مجموعے چھپے۔ یہاں سب کے نام گنانا ممکن نہیں، تاہم اقبال پر تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے پیش کرنے والوں کے چند نام یہ ہیں: مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر حمید احمد خاں، سید وقار عظیم، میرزا ادیب، نعیم صدیقی، غلام حسین ذوالفقار، خواجہ محمد زکریا، انور سدید، فتح محمد ملک، جیلانی کامران، سلیم اختر، سمیع اللہ قریشی، خواجہ حمید یزدانی، اسلم انصاری، انعام الحق کوثر، اے بی

اشرف، ملک حسن اختر، احسان اکبر، احمد ہمدانی۔

علامہ اقبال پر بعض اکابر (سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، چودھری محمد حسین، محمد دین تاثیر، عزیز احمد، آل احمد سرور، عابد علی عابد) کی تحریروں کو یک جا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کیا گیا۔ غالب، رومی، حافظ، اکبر، مودودی اور مشرق و مغرب کی بعض دیگر شخصیات سے اقبال کے تقابلی مطالعے پر مبنی متعدد مضامین اور کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

بعض اصحاب نے مربوط کتابی مطالعے پیش کیے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی صدارتی اقبال اوارڈ یافتہ **اقبال اور قرآن**، ڈاکٹر وزیر آغا کی **تصورات عشق و خرد: اقبال کی نظر میں**، پروفیسر آسی ضیائی کی **کلام اقبال کا بے لاگ تجزیہ**، ڈاکٹر خالد مسعود کی **اقبال کا تصور اجتہاد (اردو اور انگریزی)**، خواجہ منظور حسین کی **اقبال اور بعض دوسرے شعرا**، ڈاکٹر محمد ریاض کی **اقبال اور فارسی شعرا**، ڈاکٹر عبدالشکور احسن کی **اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ**، اسعد گیلانی کی **اقبال، دارالاسلام اور مودودی**، جعفر بلوچ کی **اقبال اور ظفر علی خان**، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی **اقبال سب کے لیے** جیسی کتابوں میں اقبال کے حالات اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا جامع احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

حمید نسیم (م: ۲۸ ستمبر ۱۹۹۸ء) اقبال کو حکیم اور فلسفی کہنے پر معترض ہیں۔ ان کے خیال میں وہ "حکیم الامت" نہیں بلکہ ایک شاعر ہیں، ملی شاعر جنھوں نے قوم کو ایک خاص پیغام دیا۔ حمید نسیم کا یہ خیال محل نظر ہے کہ اقبال کے مرد کامل کا تعقل بیش تر مغربی مفکروں کے افکار سے مستعار ہے۔ وہ اقبال کے خطبات کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے، البتہ اقبال کو عالمی سطح کے عظیم شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ **علامہ اقبال، ہمارے عظیم شاعر**۔

اردو میں علامہ اقبال پر مولوی احمد دین (م: ۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء) نے سب سے پہلی کتاب (اقبال، ۱۹۲۳ء) شائع کی تھی۔ علامہ نے اسے پسند نہیں کیا، کیونکہ اس سے کلام اقبال کی اشاعت متاثر ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے مصنف نے اس کتاب کے سارے نسخے جلا کر ضائع کر دیے۔ پھر ۱۹۲۶ء میں اسے از سرنو لکھا۔ جناب مشفق خواجہ نے اسے

ایک مفصل مقدمے اور حواشی کے ساتھ ایڈٹ کر کے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ کسی اقبالیاتی کتاب کی یہ ایک مثالی تدوین ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے اقبالیاتی ادب کا سب سے بڑا ذخیرہ تنقید اقبال سے متعلق ہے، جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

۸

تنقید اقبال کے اس بحر زخار میں طرح طرح کے رجحانات و رویے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تحسین و توصیف کا رویہ سب سے نمایاں ہے۔ اقبال کی فکری اساس قرآن حکیم پر استوار ہے اور اقبالی مصنفین کی عظیم اکثریت زندگی کو مذہب اور اخلاقی قدروں کے حوالے سے دیکھنے کی عادی ہے۔ پھر برعظیم کی تاریخ و سیاست کے حوالے سے، اقبال کا طرز عمل ہمیں قومی اور ملی امنگوں کے مطابق نظر آتا ہے۔ دوسرا رویہ اقبال سے اختلاف کا ہے، جس کے تحت نقادوں نے اپنے معتقدات کی روشنی میں اقبال کا تجزیہ کیا ہے۔ خودی اور تصوف کے مسئلے پر اختلاف یا اقبال کے سیاسی افکار و تصورات میں تضادات۔ (عالم خوندمیری نے خوب کہا ہے کہ یہ تضاد، اس وقت نظر آتا ہے جب ہم فکر اقبال کے کسی ایک جز کو دوسرے جز سے الگ کر دیتے ہیں۔ کُل اقبال کو پیش نظر رکھیں تو الجھن ختم ہو جاتی ہے) یا اقبال کا نظریہ قوت و پیکار (بہ علامت شاہین)۔ اسی طرح سماجی و معاشی تصورات پر اشتراکیوں کا اختلاف، جو کہیں اقبال شکنی کا رجحان بن جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال کی شخصیت کو منہدم یا اسے مجروح کرنے کی شعوری کوشش ہو رہی ہے۔

[جملۂ معترضہ: بھارت کے بعض نقاد کہتے ہیں کہ اہل پاکستان علامہ اقبال پر تنقید کے روادار نہیں اور [انھوں نے اقبال کو رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا ہے۔] اگر وہ خدوخال اقبال، ۱۹۸۶ء از محمد امین زبیری، اقبال کا علم الکلام، ۱۹۷۲ء از علی عباس جلال پوری، صدائے احتجاج، ۱۹۹۰ء از شمیم رجز، جیسی کتابیں دیکھ لیتے یا سردار محمد عبدالقیوم خاں کی تقریر پڑھ لیتے یا اقبال کے بارے میں جی ایم سید، غلام مصطفیٰ شاہ اور ابراہیم جویو کے ''ارشادات'' سے آگاہ ہوتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ پاکستان میں اقبال

"مقدس گائے" نہیں ہے بلکہ ان پر دل کھول کر مخالفانہ بلکہ متعصبانہ اور معاندانہ تنقید کی گئی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ محمد ایوب صابر کی کتاب اقبال دشمنی: ایک مطالعہ (۱۹۹۳ء) سے بھی ہوتا ہے۔ افسوس ہے اقبال دشمن عناصر نے اختلاف اور دشمنی کا فرق ملحوظ نہیں رکھا]۔

البتہ اقبال کے بیش تر نقادوں کا رویہ متوازن و معقول ہے۔ انھوں نے بعض امور میں اقبال سے اختلاف کیا مگر ان کی قرار واقعی ستایش و تحسین میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کا رویہ ناقدانہ ضرور ہے، مگر مخالفانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔

علی عباس جلال پوری کی اقبال کا علم الکلام ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اقبال فلسفی نہیں، متکلم تھے۔ فلسفی آزادانہ غور و فکر کرتا ہے مگر اقبال نے 'پہلے سے چند مفروضے قائم کر کے' انھیں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ کہ اقبال خرد دشمن اور تمدن دشمن تھے یا ان کا "نظریہ خودی بہ تمام و کمال فشتے سے ماخوذ ہے" وغیرہ۔ فنون کے صفحات پر ایک عرصے تک بشیر احمد ڈار سے ان کی قلمی معرکہ آرائی جاری رہی۔[۳۹]

ایک اور قلمی مباحثہ سلیم احمد کی کتاب اقبال: ایک شاعر نے پیدا کیا۔ ان کے خیال میں موت اقبال کا مرکزی مسئلہ ہے اور وہ اپنی شاعری کے ہر جز کے ذریعے موت سے جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح "اقبال کا تصور قوت' امام بخش گاماں پہلوان کی کشتی کو دیکھ کر پیدا ہوا ہو گا" یا "ممکن ہے ساقی نامہ والا تصور حرکت' سیالکوٹ کی کسی ندی پر نہانے کا ردعمل ہو" وغیرہ۔ پروفیسر محمد عثمان، فتح محمد ملک اور صدیق جاوید نے نوائے وقت کے صفحات پر ردعمل ظاہر کیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کا دفاع کرتے ہوئے اسے "بڑی شاعری پر بڑی تنقید" قرار دیا۔[۴۰] بہ ایں ہمہ سلیم احمد کے ان سوالات کا تشفی بخش جواب سامنے نہیں آ سکا کہ ہمارے شعرا کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات کیوں نہیں قبول کیے؟ اور ہمارے اہم ترین نقادوں (عسکری، مجنوں، فراق وغیرہ) نے اقبال سے خاطر خواہ اعتنا کیوں نہیں کیا؟ سلیم احمد نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں مزید توضیحات پیش کیں اور کتاب پر بعض اعتراضات کے جواب دیے۔ یہ مباحثہ و مکالمہ ان

کی وفات (یکم ستمبر ۱۹۸۳ء) کے بعد بھی جاری رہا۔ نظیر صدیقی، اپنے ایک مضمون (قومی زبان، کراچی، ستمبر ۱۹۸۹ء، ص ۴۴) میں لکھتے ہیں: "انھوں نے اپنی قوم کو، بلکہ نوع انسان کو موت سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بنا دیا، اور اس لحاظ سے ان کی شاعری موت کے خوف کی شاعری نہیں، بلکہ موت کے خوف پر غالب آنے کی شاعری بن جاتی ہے"۔

۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (م: ۴ اپریل ۱۹۹۵ء) نے ایک سلسلہ مضامین کا آغاز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ علامہ اقبال اس دور کے مجدد بلکہ "مجتہد مطلق" ہیں۔ موصوف کا دعویٰ تھا کہ اقبال، اجتہاد اور تعبیر شریعت کا اختیار علما اور فقہا سے لے کر قانون ساز اسمبلیوں کو منتقل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اسمبلیاں "گہری بصیرت کے حامل عوام کی منتخب" ہوتی ہیں جب کہ فقہا ملوکیت کے نمایندے اور نامزد ہوتے ہیں۔ انھوں نے بار بار اس امر پر زور دیا کہ علامہ اقبال نے اسلامی ریاست (پاکستان) کی قانون ساز اسمبلی کو "اجتہاد مطلق" کا اختیار دیا ہے۔ گورایہ صاحب کے نزدیک پاکستانی پارلیمنٹ کا وجود افکار اقبال کا مرہون منت ہے، اس لیے اس پارلیمنٹ کا اخلاقی، قومی اور تاریخی فرض ہے کہ وہ شریعت کی نئی تعبیر انجام دے کیونکہ اسی صورت میں پاکستان ایک مثالی اور جدید اسلامی ریاست بن سکتا ہے۔ اس بحث میں بہت سے اہل قلم نے حصہ لیا اور یہ مباحثہ ڈیڑھ دو برس تک چلتا رہا مگر اس ساری بحث میں اس سوال کا تشفی بخش جواب سامنے نہ آیا کہ اجتہاد اور تعبیر شریعت کا اختیار جس پارلیمنٹ کو دیا جائے گا، اس کے ارکان کا معیار کیا ہوگا؟ مروجہ جمہوریت میں تو ہرا یرا غیرا، بددیانت، خائن وغیرہ اندھا دھند اور بے تحاشا روپیا خرچ کر کے یا دھاندلی اور غنڈہ گردی کر کے رکن بن سکتا ہے۔ کیا فی الواقع علامہ اقبال ایسے ہی "مجتہدین" کو تعبیر شریعت کا اختیار سونپنا چاہتے تھے؟[۱۴۱]

اس زمانے (۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء) میں اخبارات میں "ناروے کی ناروا بحث" بھی چلتی رہی۔ دسمبر ۱۹۸۷ء میں اوسلو میں منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر جاوید اقبال اور سردار محمد عبدالقیوم خاں شریک تھے۔ تقریب میں جاوید صاحب کی تقریر سن کر سردار صاحب بے مزہ ہوئے۔ ان کے الفاظ تھے: "مجھے سخت صدمہ ہوا"۔ ردعمل میں وہ بہت سی تلخ باتیں کہ گئے۔ یہ ردعمل، علامہ اقبال سے زیادہ پسر اقبال کے خلاف تھا مگر غم و غصے کے عالم

میں، عدم توازن کا شکار ہو کر، وہ جاوید اقبال کے والد کو بھی برا بھلا کہنے لگے۔ یہ نہ سوچا کہ علامہ اقبال، محض جاوید اقبال کے والد نہیں، ملت اسلامیہ کا عظیم اور قابل فخر سرمایہ بھی ہیں اور ایک شاعر کے علاوہ احیائے دین و ملت کی ایک اہم علامت بھی۔ سردار صاحب کا لہجہ فی الواقع غیر محتاط تھا اور وہ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے، بہ قول پروفیسر محمد منور:

تھا ناروے میں ناروا، اسلوب آپ کا

انھیں اندازہ نہیں کہ انھوں نے اقبال کے مداحوں کے دل دکھائے۔ ڈاکٹر غلام علی چودھری نے اقبال کے دفاع میں من اے میر امم داد از تو خواہم کے نام سے پوری کتاب لکھ ڈالی۔ اس بحث میں بعض اصحاب (ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا صدر الدین الرفاعی، مفتی محمد حسین نعیمی وغیرہ) نے ڈاکٹر جاوید اقبال پر بھی تنقید کی۔[۴۲]

ابتدائی زمانے میں انگریزی خطبات کی طرف قارئین اقبال کا اعتنا نہ ہو سکا (شاید اس لیے کہ ان کی زبان انگریزی تھی، وہ بھی اَدَقْ۔ پہلا اردو ترجمہ ۱۹۵۸ء میں چھپا)۔ اب گذشتہ پندرہ، بیس برسوں کے دوران میں، خطبات اقبال کے مطالعے کی طرف خاصی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ خطبات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے متعدد کتابیں شائع ہوئیں، مضامین چھپے اور مذاکرے ہوئے۔ محمد شریف بقا کی **خطبات اقبال پر ایک نظر** [۱۹۷۴ء] اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ: **متعلقات خطبات اقبال** (۱۹۷۷ء) تفہیم خطبات کی اولین سنجیدہ کوششیں تھیں۔ اس کے بعد خطبات کی تسہیل و تشریح کی متعدد کوششیں سامنے آئیں، مثلاً: پروفیسر محمد عثمان کی **فکر اسلامی کی تشکیل نو** (۱۹۸۵ء) یا شعبۂ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کا مرتبہ مجموعہ: **تسہیل خطبات اقبال** (۱۹۸۶ء) یا بعض متفرق مضامین وغیرہ۔ بعدازاں بعض اصحاب نے (جن میں محمد یوسف گورایہ پیش پیش تھے) خطبات کو فکر اقبال کا "بنیادی ماخذ" قرار دیتے ہوئے زور دیا کہ اجتہاد کی عمارت علامہ کی اسی "نمایندہ کتاب" پر استوار کی جائے کیوں کہ اقبال کی شاعری، خطبات کے مقابلے میں "ثانوی حیثیت" رکھتی ہے۔ پروفیسر محمد منور کے خیال میں علامہ کا تصور اجتہاد، خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقاپسند اور ارتقاپذیر رہا، لہٰذا یہ فرض کرنا درست نہ ہو گا

کہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں انھوں نے جو کچھ کہا اور ان کی سوچ کا جو رخ، وفات سے ۸، ۹ برس پہلے ان کے خطبات میں نظر آتا ہے، وہ ۱۹۳۸ء تک جوں کا توں برقرار رہا۔ منور صاحب نے یہ بات، اس مقالے میں کہی تھی جو پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی کے زیر اہتمام خطبات اقبال پر ایک مذاکرے (۲ تا ۴ اپریل ۱۹۸۷ء) میں پیش کیا تھا۔ اس کی روداد اور مقالات پر مجموعہ مضامین اقبال: فکر اسلامی کی تشکیل نو (مرتبہ: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، ۱۹۸۸ء) اس موضوع پر ایک لائق مطالعہ کتاب ہے۔ محمد سہیل عمر نے خطبات کو ایم فل اقبالیات کے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔ اقبال اکادمی نے خطبات پر مباحث کے لیے مجلہ اقبالیات کا پورا شمارہ (جنوری ۱۹۹۷ء) مختص کیا۔ بعض اصحاب، خصوصاً ڈاکٹر وحید عشرت کی تحریروں پر جناب مظفر حسین نے گرفت کی اور انھیں "اقبال شناسی کا انحطاط" قرار دیا۔[۴۳]

چودھری مظفر حسین نے قریبی زمانے میں پاکستان اور اسلام کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی وضاحت کے لیے چند کتابچے لکھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک شاعر (علامہ اقبال) نے ہندی مسلمانوں کے لیے اسلام کے عصری تقاضوں کے مطابق ایک نصب العین متعین کر کے انھیں بہ حیثیت قوم ایک نیا جنم دیا، اور ایک سیاست دان اور مدبر (قائداعظم) نے سخت مشکلات کے باوجود ایک شاعر کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دکھایا لیکن ان کے بعد جو سیاست دان آئے، انھوں نے اپنی پچاس سالہ غفلتوں، کوتاہیوں، بدعنوانیوں اور بداعمالیوں سے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔[۴۴]
مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ نفاذ اسلام میں ناکامی کی ذمہ داری وہ دینی رہنماؤں اور جماعتوں، خصوصاً مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر عائد کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں مولانا مودودی نے علامہ اقبال کے "کلچرل طریق کار" کے بجائے "آئیڈیالوجیکل طریق کار" کو اپنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ علما کا اصل میدان تعلیم اور کردار سازی ہے اور انھیں اپنی ساری توجہ اس کام پر مرکوز رکھنی چاہیے اور عملی سیاست میں حصہ لے کر اپنی توانائیوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔[۴۵] اقبالیات کے بیش تر طلبہ کے لیے، مظفر حسین کے یوٹوپین نقطۂ نظر سے اتفاق مشکل ہو گا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے پاکستان کی عملی

صورت حال میں اقبال کے افکار و نظریات سے راہ نمائی کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود ان کی عالمانہ سوچ' اور ملک و ملت کے لیے ان کا جذبہ دردمندی و دل سوزی قابل تحسین ہے۔

۹

ایک تعجب خیز بات یہ کہ پاکستان کے نظریاتی بانی علامہ اقبال پر پاکستانی جامعات میں پی ایچ ڈی کی سطح پر بہت کم کام ہوا ہے۔ (تحقیق کار: ابو سعید نورالدین' محمد معروف' نذیر قیصر' رفیع الدین ہاشمی' صدیق جاوید' صابر کلوروی' نعیم احمد' رحیم بخش شاہین' محمد آفتاب احمد اور محمد اشرف چودھری)۔ پچاس برسوں میں کل دس مقالات' البتہ ایم اے اور ایم فل کی سطح پر خاصے مقالات تحریر ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں ۴۶ سال میں اقبالیات پر ایم اے کے تقریباً ۱۵۰ مقالے لکھے گئے۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں بھی رفتار تحقیق نسبتاً تیز ہے۔ وہاں دس برسوں میں ایم فل کے تقریباً ایک سو مقالے لکھے جا چکے ہیں اور اب وہاں اقبال پر ڈاکٹریٹ کا آغاز بھی ہو رہا ہے۔ جہاں تک جامعاتی تحقیق کے معیار کا تعلق ہے' قدر اول کی چیزیں کم ہیں۔ ابھی تک ڈاکٹریٹ کے ۶ یا ۷' ایم فل کی ایک اور ایم اے کے ۶ یا ۷ مقالوں کو اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ جامعات میں اقبال پر تحقیق' کسی بڑی اسکالرشپ کی منتظر ہے۔

اقبال اور مطالعۂ اقبال کے اثرات' وسیع الاطراف ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ متعدد شعرا کے ہاں اقبال کی فکری و معنوی تقلید اور ان کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں' مثلاً: شیخ محمد ایوب: آب حیواں' نوائے فردا' عرشی امرتسری: نقش ہائے رنگ رنگ' غلام النصیر چلاسی: معدن التوحید' گنجینہ معرفت' عاصی کرنالی: رگ جاں۔ جاوید احمد غامدی کے کلام میں بھی اقبال کا انداز و اسلوب بہت نمایاں ہے (اشراق کے متعدد شمارے) وغیرہ۔

اقبالیاتی ادب کا ایک قابل ذکر حصہ رسائل و جرائد کے خاص اقبال نمبروں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر اقبال نمبر بہ کثرت شائع ہوئے۔ بعض جریدوں نے کئی کئی جلدوں میں اور بعض نے ایک سے زائد بار خاص نمبر شائع کیے۔ اس

ضمن میں اقبال، اقبال ریویو، ادبی دنیا، نقوش، سیارہ، سب رس، برگ گل، فنون، اورینٹل کالج میگزین، صحیفہ کے نمبر اہم ہیں۔

پچاس سالوں میں علامہ اقبال پر ہر نوعیت اور ہر معیار و قدر کی کتابیں، مضامین اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی شاعری ہو یا فکروفلسفہ، مابعد الطبیعیات، خودی و بے خودی، عقل و عشق، حیات و ممات، خیر و شر، جبر و قدر، حسن و فن، فقر و تصوف اور زمان و مکان کا مسئلہ یا ان کی زندگی اور شخصیت --- شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو گا، جس پر خامہ فرسائی نہ کی گئی ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ: ”اقبالیات کے نام سے جو ذخیرۂ ادب تیار ہو چکا ہے، وہ اس پائے کا نہیں، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا“۔[۴۶] کیونکہ بہ قول تحسین فراقی:

”اقبال کو اب تک جو نقاد ملے ہیں، ان میں کم از کم نوے فی صد ایسے ہیں جن کے یہاں وہ جامعیت مفقود تھی، جو تخلیق کے جوہر مخفی کو آئینہ کر دیتی ہے--- [اس لیے] بیش تر کام افقی جہات میں ہوا ہے۔ اس میں پھیلاو تو دریا و صحرا کی خبر لاتا ہے، لیکن عمق نہیں وسعت ہے، گہرائی نہیں“۔[۴۷]

اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال پر قلم اٹھانے کے لیے جس وسعت مطالعہ اور اسکالرشپ کی ضرورت ہے، وہ ہمارے اقبالی نقادوں میں، الا ماشاء اللہ، مفقود ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

”اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لیے کئی علوم کی ضرورت ہے۔ مشرق و مغرب کے عام علوم کے ساتھ اسلامی علوم بھی سیکھے جائیں تو بات بنتی ہے۔ محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا نہیں کر سکتی“۔[۴۸]

۱۹۸۷ء کے گیلپ پاکستان کے ایک سروے کے مطابق، پاکستان کے مقبول ترین شاعر علامہ اقبال ہیں۔[۴۹] اس اعتبار سے اقبالیات، پاکستانی علوم و ادبیات کا ایک بڑا موضوع ہے اور اقبالیاتی ادب کے مختلف شعبوں میں ٹھوس تحقیق و تنقید کی نہ صرف گنجایش موجود ہے، بلکہ اشد ضرورت بھی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۴۴ء میں، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے ۱۹۵۵ء میں اور مشفق خواجہ نے ۱۹۶۶ء میں اقبالیات کے جن پہلوؤں اور موضوعات پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی، ان میں سے بیش تر ابھی تک

تشنۂ تحقیق چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ معقول کام ہوئے ہیں، وہ بعض اقبال شناسوں کی ذاتی تشویق و کوشش کا نتیجہ ہیں، تاہم انفرادی کاوشیں ایک خاص حد سے آگے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ اقبالیاتی ادب کو باثروت بنانے کے لیے، مطلوبہ تحقیقی و تنقیدی کام: ''بہتر صورت میں--- اسی وقت انجام پا سکتے ہیں جب تمام ادارے ہم آہنگ ہوں اور اقبال سے دل چسپی رکھنے والے تمام اہل علم کا تعاون حاصل کریں۔ ان اداروں کو تقسیم کار کے ساتھ اشتراک عمل کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے''۔ ۴۵

اقبالیاتی ادارے، خاص فروغ اقبالیات کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ ان کے پاس وسائل بھی ہیں۔ اگر وہ محض حکومتی سرکاری شعبوں اور اشاعتی گھروں کی حیثیت سے بلند ہو کر، اصحاب فکر و نظر کی مدد سے ٹھوس منصوبہ بندی کریں، اہداف اور ترجیحات مقرر کریں تو یقیناً کہیں زیادہ بہتر نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ اس سے اقبالیاتی ادب میں مقداری اضافہ تو ہو گا ہی، علمی لحاظ سے بھی اس کا گراف بالیقین بہ تدریج بلند ہوتا چلا جائے گا۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، پچاس برس میں اقبالیات کا ارتقا، ایک بحر زخار ہے، پوری ایک کتاب کا موضوع۔ اسے بہ عجلت ایک مختصر مضمون میں سمیٹنے کی کوشش، قدرتی طور پر ناقص و ناتمام ہی رہے گی--- بہ ہرحال: ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، ادبی ایڈیشن، ۹ ستمبر ۱۹۹۷ء۔ نظرثانی اور اضافے: جون ۱۹۹۹ء)

حوالے اور حواشی

۱۔ مذکورہ کلیات پر تبصرے کے لیے دیکھیے: **تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ** از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۲ء، باب ۱، ۲۔

۲۔ **تدوین: تحقیق**، روایت از رشید حسن خاں، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۹۔

۳۔ ایجوکیشنل ٹریڈرز، لاہور۔

۴۔ تفصیل دیکھیے: **اقبالیاتی ادب کے تین سال** ، از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، حرا پبلی کیشنز، لاہور،

۱۹۹۲ء، ص ۳۴، ۳۵۔

۵۔ حوالہ ۲، ص ۹۱۔ کلام اقبال کی تحقیقی تدوین پر جناب رشید حسن خاں کا مضمون: "کلام اقبال کی تدوین"، مطبوعہ: **سیارہ** لاہور، ستمبر ۱۹۹۶ء، اب مشمولہ: حوالہ ۲، اور اس کے ساتھ راقم کا استدراک بہ عنوان: "کلام اقبال کی تدوین، چند معروضات" بھی دیکھنا مفید ہو گا جو خاں صاحب کے مضمون سے ملحق ہے۔

۶۔ اس پر راقم کا ایک تفصیلی تبصرہ، دیکھیے: **۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب**، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳ تا ۳۱۔

۷۔ ناشر: یونی ورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، طبع دوم: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۸۔ مشمولہ: **جہات اقبال** از ڈاکٹر تحسین فراقی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲ تا ۲۹۔

۹۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۱۰۔ دیکھیے: حوالہ ۱، ص ۴۴۸، نیز: خطبۂ علی گڑھ کی دریافت کے ضمن میں راقم کی ایک توضیح دیکھیے: حوالہ ۴، ص ۳۳، ۳۴۔

۱۱۔ یہ مقالہ: **چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال: روابط** کے عنوان سے ۱۹۸۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں ۲۶ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔ بعد ازاں یہ خطوط شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّے **تحقیق نامہ** کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔ اب یہ **مکتوبات اقبال** (بنام چودھری محمد حسین) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ ناشر: الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۱۲۔ **مظلوم اقبال** کے بعض خطوط، مکمل صورت میں **شاعر** بمبئی کے اقبال نمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہو گئے ہیں۔ ۹ جون اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خطوط بہت اہم ہیں، دیکھیے: ص ۵۵۱ تا ۵۵۵۔

۱۳۔ مظفر حسین برنی نے **کلیات مکاتیب اقبال** (۴ جلدوں) میں ۱۵۷۷ خطوط مدون کیے ہیں۔ دیباچہ: حصہ چہارم (دہلی، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۷۔

۱۴۔ **اقبال نامہ** میں شامل خطوط اقبال بنام لمعہ حیدر آبادی میں سے بعض خطوط مشکوک ہیں۔ تفصیل دیکھیے: **اقبال کے کرم فرما** از ماسٹر اختر، دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۱۵۔ **اقبال نامہ**، اول کا یہ تحقیقی ایڈیشن، اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے زیر طبع ہے۔

۱۶۔ انوارِ اقبال مرتبہ: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۵۶، ۱۹۴۔

۱۷۔ ان پر تبصرہ، دیکھیے: حوالہ ۶، ص ۳۵ تا ۳۸، اور حوالہ ۴، ص ۳۷ تا ۳۸۔

۱۸۔ تفصیل دیکھیے: اختر النساء کا تحقیقی مقالہ ایم اے اردو، بہ عنوان: یوسف سلیم چشتی (بہ حیثیت شارح اردو، شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۱۹۔ مطالب بانگ درا وغیرہ، ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

۲۰۔ یہ مضمون، قدرے ترمیم کے بعد، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مجموعۂ مضامین: مسائل اقبال مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۴ء میں شامل ہے۔

۲۱۔ روزنامہ جنگ کراچی، ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء۔ یہ مضمون مصباح الحق صدیقی کی مرتبہ کتاب: علامہ اقبال، اپنوں کی نظر میں (فرحان پبلشرز لاہور، ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔

۲۲۔ دیکھیے راقم کی تالیف: اقبالیاتی جائزے (گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۰ء) میں شامل پہلے دو مضامین۔

۲۳۔ مطبوعہ: نوائے وقت، لاہور، ادبی ایڈیشن، ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء۔

۲۴۔ مشمولہ: جہات اقبال، حوالہ ۸۔

۲۵۔ حوالہ ۲۲، ص ۲۲، نیز: ص ۱۰۵ تا ۱۰۹۔ اسی کتاب میں شامل مضمون اردو میں سوانح نگاری کا حاشیہ ۱۲ بھی دیکھیے۔

۲۶۔ سرگذشت اقبال: ایک محاکمہ، خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۲۷۔ متذکرہ سوانح عمروں کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: راقم کا مضمون "اقبال صدی کی سوانح عمریاں" مطبوعہ: مجلّہ اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۸۹ء اور "علامہ اقبال کی سوانح عمریاں" مشمولہ: حوالہ ۲۲، ص ۲۲، اور ص ۱۰۱ تا ۱۱۳۔

۲۸۔ اقبالیات، مہر سنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۹۔ نیز دیکھیے: چند یادیں، چند تاثرات، حصہ دوم، از عاشق حسین بٹالوی، پیکجز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۳، ۱۳۵۔

۲۹۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین ان کے مجموعہ مضامین: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ (لاہور، ۱۹۶۵ء) میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد باقر اور صفدر محمود کے مضامین صحیفہ، لاہور، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔ ملک حسن اختر کا مضمون، ان کے مجموعے: اقبال،

ایک تحقیقی مطالعہ (لاہور' ۱۹۸۸ء) میں شامل ہے۔

۳۰۔ مشمولہ: حیات اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین 'مکتبہ جدید' لاہور' ۱۹۷۷ء۔

۳۱۔ مشمولہ: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ مکتبہ عالیہ' لاہور' ۱۹۷۷ء۔

۳۲۔ سیارہ ' لاہور' مارچ ۱۹۷۹ء نیز: اقبال کا شعلہ نوا ' ادارہ معارف اسلامی' لاہور' ۱۹۹۲ء' ص ۲۷۷ تا ۳۰۱۔ جناب نعیم صدیقی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقبال کے خلاف شبہات کا غبار پھیلا دیا جائے تو پھر جتنی روشنی ان سے حاصل کی جا سکتی ہے' وہ بھی نہیں مل سکے گی۔ (ص ۲۸۲)

۳۳۔ حوالہ ۳۱' اقبال کا شعلہ نوا ' ص ۲۹۳۔

۳۴۔ حوالہ ۳۰' ص ۳۰۸۔

۳۵۔ حوالہ ۳۰' ص ۲۳۰۔

۳۶۔ جابر علی سید کے دو مجموعے اقبال کا فنی ارتقا (۱۹۷۸ء) اقبال: ایک مطالعہ (۱۹۸۵ء) اور افتخار احمد صدیقی کی کتاب عروج اقبال (۱۹۸۷ء) بزم اقبال لاہور نے شائع کی۔ نذیر احمد کی تشبیہات اقبال (۱۹۷۷ء) اور سعداللہ کلیم کی اقبال کے مشبہ به و مستعار منه (۱۹۸۵ء) اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے چھپیں۔ نذیر احمد کی اقبال کے صنائع بدائع (۱۹۶۶ء) آئینہ ادب لاہور نے اور تبسم کاشمیری کی شعریات اقبال (۱۹۷۸ء) مکتبہ عالیہ لاہور نے شائع کی۔

۳۷۔ ان پر راقم کا ایک مضمون: "ڈاکٹر محمد اقبال: ایک ہمہ جہت اقبال شناس" مطبوعہ: قومی زبان کراچی' مئی ۱۹۹۷ء' ص ۶۰ تا ۶۳۔

۳۸۔ پاکستان کے معروف اقبال شناسوں پر ایم اے اور ایم فل کے متعدد تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں: ایم اے کے مقالات: سید نذیر نیازی' یوسف سلیم چشتی' غلام رسول مہر' بشیر احمد ڈار' ممتاز حسن' محمد عبداللہ قریشی' پروفیسر محمد عثمان' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی' ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر جاوید اقبال' عبدالرحمٰن طارق' ڈاکٹر یوسف حسین خاں' سید محمد عبدالرشید فاضل' ڈاکٹر وزیر آغا' محمد طاہر فاروقی' سید وقار عظیم۔ ایم فل کے مقالات: سید عبدالواحد معینی' ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔

۳۹۔ دیکھیے: فنون ' لاہور' جولائی ۱۹۷۳ء' فروری' جون' ستمبر' دسمبر ۱۹۷۴ء۔

۴۰۔ دیکھیے: نوائے وقت ' لاہور' ۱۱۸گست ۱۹۷۸ء' ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء وغیرہ۔

۴۱۔ تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھیے: حوالہ ۴' ص ۸۳ تا ۸۸۔

۴۲۔ حوالہ ۴، ص ۸۸ تا ۹۴۔

۴۳۔ دیکھیے: مظفر حسین صاحب کے کتابچے اقبال شناسی کے نئے زاویے (لاہور، ۱۹۹۸ء) اور اقبال شناس کا انحطاط، آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۴۴۔ علامہ اقبال اور غایت پاکستان از مظفر حسین، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۸، ۵۹۔

۴۵۔ پاکستان کی منزل مراد اور ہمارے دینی راہ نما از مظفر حسین، آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴--- جناب مظفر حسین نے حسب ذیل کتابچے بھی شائع کیے ہیں: پاکستان، نفاذ اسلام اور اقبال، (۱۹۹۳ء)، احیائے اسلام کے دو اسلوب (۱۹۹۵ء)، پاکستان کی دینی سیاست (۱۹۹۶ء)، مغربی جمہوریت اور علامہ اقبال (۱۹۹۸ء)۔

۴۶۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۹۔

۴۷۔ حوالہ ۸، ص ۱۶۲۔

۴۸۔ حوالہ ۲۰، ص ۹۔

۴۹۔ جنگ، لاہور، ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۵۰۔ مشفق خواجہ، حوالہ ۲۱۔

اذانِ اقبالیات' کلیساوں کے شہر میں

گینٹ یونی ورسٹی کی نیم تاریک سماعت گاہ میں مختلف مندوبین' علامہ اقبال کے افکار و تصورات پر مقالات پیش کرتے' پھر اس پر بحث مباحثہ اور سوال جواب ہوتے۔ مقالات و مباحث سنتے ہوئے' میرا ذہن بار بار "شکوہ" کے اس معروف شعر (خصوصاً اس کے اولین مصرعے) کی طرف منتقل ہو رہا تھا:

دیں اذانیں کبھی' یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شہر گینٹ (Gent) بلجیم کے دارالحکومت برسلز سے ۵۶ کلومیٹر مغرب کی جانب واقع ہے۔ قرون وسطیٰ میں یہ شمالی یورپ کا دوسرا بڑا شہر اور معروف تجارتی مرکز تھا۔ اب اس خوب صورت شہر کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ یونی ورسٹی کی یہ عمارت بھی' جہاں اقبال سمپوزیم منعقد ہو رہا تھا' کسی زمانے میں ایک مسیحی صومعہ (monastery) کی عمارت تھی۔ کچھ تو اس پس منظر کے سبب' اور کچھ باہر آسمان پر گھرے ابر کی وجہ سے' سماعت گاہ کا ماحول نیم تاریک سا ہو رہا تھا۔ اس ماحول میں جب مقالوں اور بحث و مباحثے میں فکر اقبال کا کوئی روشن نکتہ دل و دماغ پر دستک دیتا تو "شکوہ" کے متذکرہ بالا مصرعے کی طرف ذہن منتقل ہونا' بالکل قدرتی امر تھا۔

علامہ اقبال سے اہل یورپ کا اولین تعارف اسرار خودی کے انگریزی ترجمے (The Secrets of the Self' ڈاکٹر نکلسن' ۱۹۲۰ء) کے ذریعے ہوا تھا۔ بعد ازاں متعدد یورپی زبانوں (انگریزی' جرمن' فرانسیسی' چیک' اطالوی اور روسی وغیرہ) میں علامہ اقبال

کے خطبات اور شاعری کے تراجم ہوئے۔ اس ضمن میں مادام ایوا میوروو‌چ، پروفیسر بوسانی، پروفیسر آربری، وکٹر کیرنن، ژاں ماریک، این میری شمل اور ڈیوڈ میتھیوز کی خدمات قابل قدر ہیں۔ قریبی زمانے میں سویڈش، رومانوی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی تراجم اقبال شائع ہوئے ہیں۔ مزید برآں متعدد یورپی مصنفین نے اقبال کے فکر و فن پر قلم اٹھایا ہے، جیسے: پری گارینا، لینی ایس اے، لوس کلاڈ میتری، باربرا مٹکاف، چیلی شیو، ایل پولن سکایا، ایم اسٹی پن یانٹس وغیرہ۔[۱]

اقبال صدی کے موقع پر یورپ کے بہت سے اقبال شناس اور اقبال دوست مستشرق، پہلی عالمی اقبال کانگریس (لاہور، ۲-۸ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں شریک ہوئے۔ ان میں پروفیسر بوسانی، ڈاکٹر ویتو سالیرنو، پروفیسر بیورگل، ژاں ماریک، شیلامیک ڈونو، کارل ایلف سوینگ اور رالف رسل بھی شامل تھے۔

اس موقع پر شائع ہونے والی بیسیوں کتب اقبالیات کے ذریعے، مطالعہ اقبال کا ایک رجحان پیدا ہوا اور وقت کے ساتھ، رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہائیڈل برگ اور کیمبرج کی جامعات میں اقبال سے منسوب، مسندیں (Chairs) قائم ہوئیں۔ برمنگھم میں اقبال اکیڈمی یوکے قائم ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اپنے مضامین اور دیگر کاوشوں کے ذریعے یورپ خصوصاً برطانیہ میں اقبال شناسی کے لیے ایک سازگار فضا بنانے میں حصہ لیا۔[۲] اس پس منظر میں کئی برس پہلے "اقبال فاؤنڈیشن یورپ" کا قیام عمل میں آیا جس میں جناب توحید احمد نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ وہ ایک اقبال دوست سفارت کار ہیں اور آج کل (۱۹۹۹ء) سنگاپور میں پاکستان کے ہائی کمشنر ہیں۔ اس زمانے میں وہ برسلز کے پاکستانی سفارت خانے سے وابستہ تھے۔

برسلز، اقبال فاؤنڈیشن یورپ کا مرکز قرار پایا کیوں کہ گذشتہ دو تین عشروں میں اسے یورپ کے مرکز ثقل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ لندن، پیرس اور جنیوا کی نسبت اب برسلز میں زیادہ بین الاقوامی ادارے قائم ہیں۔ ناٹو اور یورپی برادری کی دیگر تنظیموں نے بھی برسلز ہی کو مرکز بنالیا ہے۔ یورپ کے اقبال شناسوں میں پروفیسر شمل کا نام سرفہرست ہے چنانچہ بجا طور پر وہ اقبال فاؤنڈیشن یورپ کی صدر قرار پائیں اور ڈاکٹر سعید اختر درانی

اور لووین یونی ورسٹی کے پروفیسر فرمیولین نائب صدور مقرر ہوئے۔

قرطبہ کی بین الاقوامی اقبال کانفرنس (۱۹ ـ ۲۱ نومبر ۱۹۹۱ء) کے موقع پر منعقدہ، فاؤنڈیشن کے مشاورتی اجلاس میں پاکستانی مندوبین کو بھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس میں اقبال لائبریری کے قیام، انگریزی میں کتابیات اقبال کی تیاری اور ایک اقبال کانفرنس کے انعقاد پر گفتگو ہوئی تھی۔[۳] فاؤنڈیشن کے مالی وسائل محدود بلکہ معدوم تھے، اس لیے گذشتہ کئی برسوں میں صورت حال جوں کی توں رہی، اور اب کہیں آ کر حکومت پاکستان کی اعانت سے یہ ممکن ہوا کہ ایک عالمی اقبال سمپوزیم منعقد کیا جائے۔

۲

Iqbal and the Modern Era (اقبال اور عہد جدید) کے موضوع پر یہ سمپوزیم ۱۸ ـ ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء کو گینٹ یونی ورسٹی میں منعقد ہوا اور اس میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوئے:

۱۔ پروفیسر این میری شمل (Annenmarie Schimmel، جرمنی)
۲۔ جناب ریاض محمد خاں (سفیر پاکستان، بلجیم)
۳۔ پروفیسر جے سی بیورگل (J.C. Burgel، برن یونی ورسٹی، سوئٹزرلینڈ)
۴۔ پروفیسر ژاں ماریک (Jan Marek، چارلس یونی ورسٹی، پراگ)
۵۔ ڈاکٹر نتالیا پری گارینا (Natalia Prigarina، اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، ماسکو)
۶۔ پروفیسر وتیو سالیرنو (Vito Salierno، سائنٹی فک ہائی کالج، میلان، اٹلی)
۷۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی (صدر، یوکے اقبال اکیڈمی، برمنگھم)
۸۔ پروفیسر صبری تبریزی (ایڈنبرا یونی ورسٹی، اسکاٹ لینڈ)
۹۔ پروفیسر وان ٹونگرلو (Van Tongerloo، لووین یونی ورسٹی، بلجیم)
۱۰۔ پروفیسر آربن فرمیولین (Urbain Vermeulen، لووین یونی ورسٹی، بلجیم)
۱۱۔ جناب محمد اکرام چغتائی (اردو سائنس بورڈ، لاہور)
۱۲۔ ڈاکٹر ایم اے تحسین فراقی (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور)

۱۳۔ جناب محمد سہیل عمر (ناظم: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور)

۱۴۔ جناب خالد احمد (مدیر: فرائی ڈے ٹائمز، لاہور)

۱۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور)

پاکستان سے ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر وحید قریشی اور حکیم محمد سعید بھی مدعو تھے لیکن یہ حضرات اپنی دیگر مصروفیات کے سبب شریک نہ ہو سکے۔ اسی طرح فرانس کے ڈاکٹر فرانسس لامان (Francis Lemand) صدر ادارہ: Islam and the West اور مہتمم بین الاقوامی اقبال کانفرنس (قرطبہ، ۱۹۹۱ء)، بلجیم کے پروفیسر ایمی لو پلاٹی (Emilio Platti) اور ڈاکٹر کیلے وارٹ (Callewaurt) کے نام بھی مقالہ نگاروں کی فہرست میں شامل تھے۔ بہ وجوہ تینوں اصحاب، سمپوزیم میں شریک نہیں ہو سکے۔ برطانیہ سے جناب عزیز الدین احمد اور جناب مصطفیٰ علی خاں بہ طور مبصر شریک ہوئے۔

۳

۱۸ نومبر کو صبح ساڑھے نو بجے گینٹ یونی ورسٹی کے فیکلٹی کلب میں کافی اور چائے پر ملاقاتوں اور باہمی تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ پھر دوسری منزل پر واقع سماعت گاہ میں ۱۰ بجے افتتاحی اجلاس شروع ہوا۔ سٹیج کے عقب میں سبز کپڑے کے ایک لمبے قطعے پر سفید حروف میں یہ عبارت دمک رہی تھی:

International Symposium

on

"Iqbal and the Modern Era"

18-19 November 1997,

University of Gent, Belgium,

Iqbal Foundation Europe.

یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ فرش لکڑی کا تھا اور چھت، بڑے بڑے سیاہ چوبی شہتیروں پر رکھی ہوئی کڑیوں پر، ٹکی ہوئی تھی۔ ہال کے اندر روشنی کے قمقمے تعداد میں بہت کم تھے،

اور زیادہ روشن بھی نہیں تھے البتہ بائیں سمت کی کھڑکیوں سے کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ پروفیسر فرمیولین نے مائیک پر آکر تعارفی اور استقبالیہ کلمات سے اجلاس کا آغاز کیا۔ انھوں نے علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے' نہ صرف برعظیم اور عالم اسلام بلکہ پوری دنیا پر' گہرے اور غیر معمولی اثرات (tremendous influence) ڈالے۔ ان کی کاوشوں کی غرض و غایت اسلامی دنیا میں مسلم تشخص کو اجاگر کرنا اور پھر پوری انسانیت کی نشوونما اور ترقی تھا۔ فرمیولین صاحب نے اس مذاکرے کے انعقاد کے لیے پاکستانی سفارت خانے کے تعاون پر شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے قونصلر جناب حسن جاوید کی بھرپور مساعی اور تگ و دو کا خاص طور پر ذکر کیا' اسی طرح یونی ورسٹی اور اِبِسْ (IBIS) ہوٹل والوں کے تعاون پر بھی اظہار ممنونیت کیا۔

پروفیسر فرمیولین کا انداز گفتار بہت کڑا' پرجوش اور توانا و بھرپور تھا۔ اس کے برعکس سفیر پاکستان جناب ریاض محمد خاں کے لب و لہجے میں نرمی و ملائمت اور افہام و تفہیم غالب تھی۔ انھوں نے کہا کہ افتتاحی کلمات پیش کرنا میرے لیے باعث اعزاز ہے' اور میں اس مذاکرے کے انعقاد کے لیے فاؤنڈیشن کا' خصوصاً پروفیسر شمل اور پروفیسر فرمیولین کا ممنون ہوں۔ اسی طرح انھوں نے اپنے رفقائے کار اور حکومت پاکستان کا بھی شکریہ ادا کیا جس نے اس مذاکرے کو گولڈن جوبلی کا حصہ بناتے ہوئے مالی وسائل فراہم کیے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں اقبالیات کا ماہر نہیں ہوں' پھر بھی چند نکات آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ ان پر غور کریں' مثلاً:

۱۔ بلاشبہ اقبال ایک بڑے مسلم دانش ور تھے' مگر انھوں نے عقل پر جو تنقید کی ہے' وہ کس حد تک مناسب ہے؟

۲۔ پھر اجتہاد کا مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجتہاد کے لیے اقبال نے کچھ اصول مقرر کیے ہیں؟ اور یہ اصول جدید حالات سے مطابقت رکھتے ہیں؟ اور کیا یہ ہماری ضرورت پوری کرتے ہیں؟

۳۔ اقبال نے پاکستان پر کس حد تک ذہنی و فکری اثرات مرتب کیے ہیں؟ کیا ہمارے ملک میں بنیاد پرستی کی حالیہ تحریکوں میں اقبال کے کچھ اثرات ہیں؟ اگر ہیں تو کس

نوعیت کے؟

سٹیج کی لمبی میز ایک سبز میز پوش سے ڈھانپی گئی تھی اور سامنے کی جانب میز پوش پر بنا ہوا سفید چاند تارا ہم پاکستانیوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میز کے عقب میں رکھی گئی کرسیاں ابھی تک خالی تھیں۔ یوں یہ افتتاحی نشست کسی باقاعدہ صدر کے بغیر شروع ہو چکی تھی۔ (البتہ سفیر صاحب کی تقریر کے بعد پروفیسر فرمیولین نے سٹیج پر رکھی ہوئی ایک کرسی سنبھال لی)۔

اقبال فاؤنڈیشن نے کئی برس' پہلے یورپی زبانوں میں لوازمہ اقبالیات پر مشتمل' انگریزی کتابیات مرتب کرنے یا کرانے کا ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے یہ منصوبہ پروفیسر کیلے وارث کو سونپا گیا۔ عین انھی ایام میں انھیں بھارت کا سفر درپیش ہوا۔ وہ ایک رپورٹ مرتب کر کے دے گئے' جو ڈاکٹر ڈینیل ڈی سمٹ (Daniel De Smet) نے پڑھ کر سنائی۔ رپورٹ مایوس کن تھی۔ اندازہ ہوا کہ کیلے وارث صاحب' اس شعبے میں ہونے والی پیش رفت اور کام سے کچھ زیادہ باخبر نہ تھے۔ چنانچہ ان کے مقالے کے اختتام پر سہیل عمر صاحب نے وضاحت کی کہ اس پر پاکستان میں خاصا کام ہو چکا ہے۔ راقم کی کتابیات اقبال کا بھی ذکر آیا جس کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن انھی دنوں سے زیر کتابت چلا آرہا ہے۔

مادام شمل نے Iqbal and Classical Islamic Tradition کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ان کے سامنے تحریری مقالہ نہیں' بلکہ کاغذ کے دو تین چھوٹے چھوٹے پرزے تھے۔ انھوں نے سرنیہوڑاے تقریباً نصف گھنٹے تک نہایت پر اعتماد اور رواں دواں لہجے میں گفتگو کی۔ گاہے گاہے نیم وا آنکھوں سے پرزوں پر بھی نظر ڈال لیتیں مگر لگتا تھا کہ ان کے بغیر بھی انھیں اسی مہارت سے بولنے کا ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے کلاسیکل اسلام کو فکر جدید سے ملا کر پیش کیا ہے اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ اس سلسلے میں جاوید اقبال سے میری بہت بحثیں ہوئی ہیں۔ شمل نے عربوں پر فکر اقبال کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال پر مباحثوں میں اس کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ سعودی عرب میں اقبال کے خطبات پر ابھی تک پابندی ہے۔ [راقم کے خیال میں یہ بات

تحقیق طلب ہے۔]

شمل صاحبہ نے کہا کہ یمن کے ایک یونی ورسٹی میگزین میں بھی' میں نے اقبال پر مضامین دیکھے ہیں۔ بلاشبہ اقبال' ملت اسلامیہ کے احیا کے شدید متمنی تھے' مگر ان کے ہاں' اسلام کی تعبیر' بہ ہرحال جدید ہے۔ مسلمانوں کے لیے اقبال کی عطا سے انکار ممکن نہیں' مگر یہ ضرور ہے کہ اقبال پر بات کرتے ہوئے چند پہلو نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ ایسے تضادات ہیں' جو بہ ہرحال تضادات ہوتے ہوئے بھی fascinating ہیں' بالکل زندگی کی طرح۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اقبال آج ہمارے لیے کتنے اہم اور relevant ہیں؟ کیا ان کی صرف صوفیانہ جہت اہم ہے یا کچھ اور پہلو بھی؟ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال نے اسلامیوں کے اندر ایک نئی روح پھونکی ہے۔ وہ نمایندہ ہے علم الکلام کا' وہ نمایندہ ہے عشق کا' جو روایتوں کو ختم کر کے ایک نئی بات پیدا کرتا ہے اور یوں تسخیر کائنات کا راستہ سمجھاتا ہے۔ آخر میں مادام شمل نے تأسّف کے ساتھ کہا:

It is pity that Hakeem Muhammad Saeed is not here and also Javid Iqbal is not here.

ڈاکٹر شمل کی تقریر مربوط اور موثر تھی۔ پتا چلتا تھا کہ انھوں نے اقبال کو پڑھ رکھا ہے اور اقبال سے ان کا تعلق محض اکیڈمک نہیں' قلبی اور ذہنی بھی ہے' اور یہ "نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں"۔ اقبال سے ان کے اولین تعارف اور ذہنی وابستگی کا ذکر میں نے ان کے ایک مضمون [کے ترجمے] میں پڑھا تھا۔ یہاں اس کا ایک حصہ نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہو گا۔ شمل بتاتی ہیں:[۴۴]

اقبال کے کلام کی' میں اپنے زمانۂ طالب علمی سے معترف رہی ہوں۔ اقبال ہندستان کے وہ مسلم شاعر ہیں جنھیں پاکستان کا روحانی باپ کہا جاتا ہے اور جن کے کلام میں مغرب اور مشرق کی شاعری کی ان اقدار کا' جن کا مظہر گوئٹے اور رومی کی ذات ہیں' ایک دل ربایانہ امتزاج پایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آنے کے بعد' میں ان پر لکھی گئی چند تصانیف' حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پھر ایک عجیب اتفاق نے روڈلف پان وٹس (Rudolf Pann Witz) کی بدولت مجھے ایک ضعیف العمر جرمنی شاعر سے ملوا دیا۔ انھوں نے

کسی وقت اقبال کے کلام کے چند انگریزی تراجم کو جرمن زبان میں ترجمہ کیا تھا اور انھیں لاہور بھیجا تھا' جو وہاں اب اقبال میوریم میں نمایش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔[۵] اقبال نے اظہار تشکر کے طور پر اپنی دو کتابیں انھیں بھیجی تھیں جنھیں وہ پڑھ نہیں سکے تھے۔ انھوں نے وہ دو کتابیں مجھے دے دیں۔ ان کا نام ہانز مانکے (Hans Meinke) تھا اور یہ کتابیں پیام مشرق 'گوئٹے کی طربیہ خداوندی کا جواب اور جاوید نامہ جس میں روح سات طبق کے سفر کرتی ہے' تھیں۔ جاوید نامہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کرنے سے میں خود کو روک نہ سکی۔ ان دنوں اقبال کے لیے مجھ میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ میں مسلسل ان کے غیر معمولی مصلحانہ لیکن گہرے صوفیانہ تصورات پر بات کرتی رہی۔ نتیجے میں میرے ترکی دوستوں نے اس رزمیہ (جاوید نامہ) کو ترکی زبان میں ترجمہ کرنے پر مجھے اکسایا۔ منظوم ترجمہ تو نہیں لیکن باشرح ترجمہ۔ اس کی بدولت ۱۹۵۸ء میں مجھے پاکستان کے سفر کا دعوت نامہ ملا۔

وہاں پہنچ کر میں نہ صرف اقبال کی یادوں اور ان کے کلام کے اثرات سے واقف ہوئی بلکہ ملک کی مختلف زبانوں اور ان کے ادب میں میری دل چسپی بڑھی اور سندھی زبان جو وادی سندھ کے زیریں حصے میں مروج ہے' اس پر تو میں دل و جان سے فریفتہ ہو گئی۔ شاہ عبداللطیف اور ان کے جانشینوں کے کلام کا مطالعہ' میرے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا روحانی مشغلہ بن گیا۔

۴

مطبوعہ پروگرام کے مطابق اب حکیم محمد سعید صاحب کی باری تھی' مگر وہ نہیں آسکے تھے' اس لیے پروفیسر صبری تبریزی کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ ان کا موضوع تھا:

Relevance to the Present-Day World:

Persian Writings of Iqbal.

تبریزی صاحب کا وطن مالوف ایران ہے۔ عرصہ دراز تک وہ ایڈنبرا یونی ورسٹی میں تدریس کرتے رہے۔ آج کل وہ آذربائیجان میں ہیں۔ ان کا مقالہ تو اتنا طویل نہیں تھا' مگر مقالہ خوانی کے دوران میں' ان کی وضاحتیں سامعین پر خاصی بھاری ثابت ہو رہی تھیں۔

توضیحات کے لیے وہ اقبال کے اشعار پڑھتے' ان کا ترجمہ کرتے اور پھر تشریح۔ دراصل ایک مدرس کو اچھے سامعین کبھی کبھی ہی میسر آتے ہیں۔ (ہوٹل میں ناشتے کی میز پر' تبریزی بالعموم ہمارے ساتھ آ بیٹھتے اور ہم سے good listeners کا خراج وصول کرتے)۔ مقالہ خوانی کے لیے نصف گھنٹے کی حد مقرر تھی' مگر تبریزی کے جوش خطابت نے ایک گھنٹہ لیا۔ اس وقت سامعین کی تعداد بھی کسی قدر کم ہو چکی تھی حالانکہ پروفیسر شمل کی تقریر میں حاضری ۷۰' ۷۵ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں سمپوزیم کے مندوبین کے علاوہ' زیادہ تر یونی ورسٹی کے طلبہ و طالبات تھے۔ برسلز میں مقیم بعض پاکستانی بھی آئے ہوئے تھے۔

نصف گھنٹے کے باقی ماندہ وقفے میں سب سے پہلے تو ڈاکٹر درانی نے اقبال فاؤنڈیشن یورپ کے سلسلے میں کچھ وضاحتیں پیش کیں۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال فاؤنڈیشن کا خیال' پہلے پہل جناب توحید احمد نے پیش کیا تھا۔ یہ نومبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے' جب وہ برسلز کے پاکستانی سفارت خانے سے وابستہ تھے۔ توحید صاحب ہی نے پروفیسر شمل کو فاؤنڈیشن کی صدارت پر رضامند کیا جو درانی کے خیال میں دور حاضر کے اقبال شناسوں میں شمل سرفہرست ہیں۔ ان کے بہ قول: She is the greatest living Iqbalist of the World۔ توحید صاحب سیکرٹری مقرر ہوئے' پھر ان کا تبادلہ ہو گیا تو پروفیسر کیلے وارٹ نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔

درانی کے بعد' سہیل عمر صاحب نے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اقبال فاؤنڈیشن کے منصوبے کتابیات اقبال اور مادام شمل کے نکات گفتگو سے متعلق بعض تفصیلات سامعین کے گوش گزار کیں اور منصوبے کی بعض واضح خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ منصوبے کے خدوخال ترتیب نو کے متقاضی ہیں۔ یہ اہم نکتہ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس نوعیت کی دیگر کاوشوں کے سلسلے میں ماہرین اقبال نے جتنا مواد جمع کر دیا ہے' اس سے صرف نظر نہ ہو اور تکرار کار میں توانائی اور وسائل کا اتلاف نہ ہو۔ اس ضمن میں انھوں نے کتابیات پر ہونے والے کام اور اہم مآخذ کا مختصر تذکرہ کیا جس میں رفیع الدین ہاشمی کی ۱۹۹۷ء تک کی کتابیات اقبال' مجلّہ اقبال' مجلّہ اقبالیات اور اقبال ریویو کے

اشاریے اور اقبال اکادمی کی زیر تکمیل Website کا اجمالی تعارف شامل تھا۔ سہیل صاحب نے اس منصوبے کے لیے خصوصاً اور فاؤنڈیشن کے لیے عموماً ممکنہ علمی امداد اور عملی تعاون کی پیش کش کی۔[۶]

مادام شمل کی معروضات کے ضمن میں سہیل عمر صاحب نے بڑے احترام و ادب سے چند اختلافی نکات پیش کیے۔ عرب دنیا اور عربوں کے طرز احساس اور اقبال کے کلام کے حوالے سے انھوں نے کہا: یہ درست ہے کہ عالم عرب میں اقبال کے کلام اور افکار کو اس طرح پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جیسے فارسی گو علاقوں میں اس کا استقبال ہوا، تاہم یہ سمجھنا درست نہ ہو گا کہ عالم عرب، اقبال کے نام اور کلام سے بے خبر ہے۔ ان کا تقریباً سارا کلام عربی میں منتقل ہو چکا ہے۔ حال ہی میں اقبال کے انگریزی خطبات اور بال جبریل کے نئے عربی تراجم سامنے آئے ہیں اور ان پر متعدد مقالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ ان تمام کاوشوں کا اندازہ عام ماخذ کتابیات سے نہیں ہوتا۔

ابن عربی اور علامہ اقبال کے فکری تعلق پر بھی سہیل عمر نے اپنی حالیہ تحقیقات کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور اس ضمن میں پھیلی ہوئی عام اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی رائے میں علامہ اور شیخ اکبر کے فلسفیانہ افکار میں مماثلت کے عناصر، اختلاف سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ موضوع مزید تلاش و تفحص کا تقاضا کرتا ہے۔

وقفہ طعام کے بعد دو بجے دوسری نشست شروع ہوئی۔ ڈاکٹر درانی نے بعض اصحاب کی تجویز پر اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر طلبہ کے لیے ایک مختصر تعارف پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال، نوجوانوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ ایک سادہ مزاج مگر دانش مند، فہیم اور بابصیرت انسان تھے۔ درانی صاحب نے اقبال کے تصور خودی، عقل و عشق، اجتہاد اور فلسفہ جدوجہد کی وضاحت کی۔ آخر میں انھوں نے کہا: اقبال کو علم سے ویسی ہی محبت تھی، جیسی محبت آج بھی بلجیم میں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر فرمیولین نے سر ہلاتے ہوئے، اس پر یوں تبصرہ کیا:

Yes, we are a small country but a great people.

چائے / کافی کے وقفے سے پہلے دو مقالے پیش ہوئے۔ ایک پروفیسر بیوروگل کا،

دوسرا ڈاکٹر 'Muhammad Iqbal's Ideas: Poet's Role in the Society
ژاں ماریک کا (وہ اردو میں اپنا نام یحییٰ ماریک لکھتے ہیں) بہ عنوان:

Iqbal and Islamic Fundamentalism, Nationalism and Patriotism

دونوں مقالے اپنے اپنے موضوع پر اچھے تھے اور پسند کیے گئے۔ وقفے کے بعد مزید دو مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے Iqbal, as a bridge between East and West کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ فارسی اشعار جدید ایرانی لب و لہجے میں نہیں، بلکہ قدیم ہندستانی لہجے میں پڑھنے پر انھوں نے، خصوصاً صبری تبریزی سے معذرت کی۔ محمد سہیل عمر کے مقالے کا عنوان تھا:

That I may See and Tell

The Significance of Iqbal's Wisdom Poetry

مقالے میں انھوں نے مشرق و مغرب کے روایتی نظریہ شعر کے حوالے سے شعری تخلیق اور اس کی کائناتی معنویت پر روشنی ڈالی اور اس تناظر میں کلام اقبال کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال اپنے اسلوب اور معنوی عناصر کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کی اس درخشاں روایت شعر کے آخری بڑے نمایندے ہیں جسے شعر حکمت کہا گیا ہے۔ سہیل صاحب کا انداز مقالہ خوانی خوب تھا' تلفظ عمدہ اور ٹھہراو' چنانچہ مقالہ دل چسپی سے سنا اور بہ خوبی سمجھا گیا۔ آخر میں سوال جواب ہوئے۔

ساڑھے پانچ بجے یہ نشست ختم ہوئی تو باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔

۵

۱۹ دسمبر کی اولین نشست خاصی طویل تھی (ساڑھے نو تا ایک بجے)۔ روسی مندوب ڈاکٹر نتالیا پری گارینا کے مقالے کا عنوان تھا: The Problems of Interpretation of Iqbal's Poetry at the end of 20th Century.

پری گارینا' رشین اکیڈمی آف سائنسز کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز کی سربراہ ہیں' فارسی پر دسترس رکھتی ہیں اور اردو بھی سمجھ لیتی ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی بھی پیام

مشوق کی شاعری سے متعلق تھا۔ اقبال سے ان کا اولین تعارف دل چسپ طریقے سے ہوا۔ بتاتی ہیں کہ میں کسی مشرقی موضوع پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھی۔ مجھے مرزا غالب پر ایک کتاب ملی، پڑھی تو مرزا غالب پسند آئے۔ میں نے انھی پر ریسرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یونی ورسٹی کے متعلقہ شعبے کے سربراہ پروفیسر چیلی شیو تھے۔ انھیں جا کر ملی تو انھوں نے کہا: بر عظیم میں مرزا غالب کے علاوہ بھی بڑی باکمال شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔ اقبال ایسی ہی ایک بے مثال شخصیت ہیں جن کے افکار و نظریات پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کہتے ہوئے چیلی شیو صاحب نے پری گارینا کو اقبال پر ایک کتاب پڑھنے کے لیے دی اور کہا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد بھی، اگر آپ مرزا غالب پر تحقیقی کام کرنا چاہیں گی تو میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔

ڈاکٹر پری گارینا کہتی ہیں کہ میں یہ کتاب بے دلی سے گھر لے آئی۔ مگر پھر کیا ہوا؟ بہ قول پری گارینا: "میں نے چند صفحات ہی پڑھے تھے کہ وہ روشنی کا مینار مل گیا جو میری آرزوؤں کا مرکز تھا۔ مجھے میری منزل مل گئی اور میں نے علامہ اقبال کو اپنا تحقیقی موضوع بنایا"۔ [۷]

ایک اقبال سکالر کے لیے، اقبال کا وطن (پاکستان) دیکھنے کی خواہش فطری ہے۔ پری گارینا نے ایک بار لندن میں ایک پاکستانی خاتون صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے، اس تمنا کا اظہار، قدرے افسوس اور شکوے کے انداز میں کیا، کہنے لگیں:

"ابھی تک مجھے پاکستان جانے کا اتفاق نہیں ہوا کیونکہ مجھے وہاں سے آج تک کسی نے مدعو ہی نہیں کیا۔ میری خواہش ہے کہ میں اقبال کا آبائی شہر دیکھوں۔ ان درس گاہوں کو دیکھوں جہاں سچے جذبوں کے اس عظیم شاعر نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے مزار پر عقیدت و احترام کے پھول پیش کروں، لیکن میں بن بلائے پاکستان کیسے جا سکتی ہوں۔ دس بار بھارت گئی ہوں اور وہاں جس والہانہ انداز میں میری پذیرائی ہوتی رہی ہے، میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بلاشبہ ہندستان میں میری آؤ بھگت، میری اقبال سے وابستگی کی وجہ سے ہی ہوئی ہے کیونکہ وہاں مجھے اقبال پر لیکچر دینے کے لیے ہی بار بار مدعو کیا جاتا ہے، ویسے بھی اقبال کے علاوہ میرے پاس اور کوئی موضوع ہے ہی نہیں"۔ [۸]

حسن اتفاق سے اس کے جلد ہی بعد، انھیں پاکستان میں ادیبوں اور دانش وروں کی عالمی کانفرنس (اسلام آباد، ۱۹۹۵ء) میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔

اس اجلاس کی صدارت پروفیسر شمل کر رہی تھیں۔ مہمان خصوصی سفیر پاکستان جناب ریاض محمد خاں تھے اور کارروائی ڈاکٹر درانی چلا رہے تھے۔ دوسرا مقالہ جناب خالد احمد کا تھا۔ موصوف ایک معروف، کہنہ مشق اور صاحب مطالعہ صحافی ہیں۔ "لبرل" خیالات رکھتے ہیں۔ ان دنوں فرائیڈے ٹائمز کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا موضوع تھا: Iqbal's View of Fiqh۔ مقالہ خوانی کے ساتھ، وہ غیر تحریری "حواشی و تعلیقات" بھی بیان کرتے چلے گئے۔ ان کی تحریر و تقریر کا زیادہ تر حصہ، حدود اور ان کے نفاذ کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار پر مشتمل تھا۔ زیادہ زور، اقبال کے تصور فقہ کے بجائے، حیثیت حدود کی نفی پر رہا۔ راقم کو خالد صاحب کی یہ ادا پسند نہیں آئی اس لیے کہ اول: یہ مبحث، اصل موضوع سے براہ راست متعلق نہ تھا، دوسرے: ان خیالات کے اظہار کا یہ موقع محل بھی نہ تھا۔ انھیں جو کچھ کہنا یا لکھنا تھا، وہ اپنے ملک میں کہتے یا لکھتے تو زیادہ مناسب ہوتا، کیوں کہ یہ ایک طرح سے پاکستان اور مسلم معاشرے کا داخلی مسئلہ تھا۔ غیر مسلموں بالخصوص یورپیوں کے لیے اسے سمجھنا آسان نہ تھا، اسی لیے ان کی تقریر کے دوران میں بعض سامعین نے کئی بار، بعض الفاظ و اصطلاحات کے بارے میں استفسارات کر کے وضاحت چاہی۔

اس طرح کے سیمی ناروں کے مطبوعہ اور مقررہ پروگرام میں بالعموم تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر اس سمپوزیم کی کارروائی مطبوعہ ترتیب کے بالکل مطابق چل رہی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی (اور منتظمین کے لیے لائق مبارک باد)۔ مطبوعہ ترتیب میں ابھی تک صرف ایک رد و بدل ہوا تھا۔ صبری تبریزی صاحب کو ۱۹ نومبر کی سہ پہر مقالہ پڑھنا تھا مگر انھیں دوسرے دن، ان کے مقررہ وقت تک منتظر رکھنے کے بجائے، حکیم محمد سعید صاحب کی باری پر اسی نشست میں ان سے مقالہ سنا گیا۔

اس نشست میں حسب پروگرام مزید تین مقالے پیش ہوئے۔ پروفیسر ویتو سالیرنو کا موضوع تھا: Iqbal and Italy۔ وہ کئی برس پہلے، اطالوی زبان کی تدریس کے سلسلے میں

کراچی یونی ورسٹی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء کی اقبال کانگریس لاہور میں بہ طور مندوب شریک ہوئے، پھر ۱۹۹۱ء میں قرطبہ کی اقبال کانفرنس میں بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ اقبال اور مسولینی کی ملاقات کا ثبوت مل گیا ہے۔ میں نے ملاقاتیوں کی اس کتاب (Vistors' Book) کا کھوج لگا لیا ہے جس میں اقبال کے دستخط موجود ہیں۔ دوسرا مقالہ محمد اکرم چغتائی کا تھا: Iqbal and Germany' اس مقالے میں چغتائی صاحب نے اقبال کے قیام جرمنی اور جرمن کلچر سے ان کی وابستگی کے حوالے سے گفتگو کی اور بتایا کہ اقبال جرمنی کو اپنا وطن ثانی کہا کرتے تھے[۹]۔ انھوں نے اقبال پر عطیہ کی کتاب کو سوانح اقبال کے حوالے سے ایک بے مثال ماخذ قرار دیا۔[۱۰] چغتائی نے بتایا کہ ویگے ناسٹ کی حیثیت ہائیڈل برگ میں ٹیکنیکل اسسٹنٹ کی تھی۔ انھوں نے اقبال کے خطبات پر رودی پاریٹ (Rudi Paret) اور جوزف ہیل (Josef Hell) کے تبصروں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ رودی پاریٹ سے اقبال کا تعارف جوزف ہیل کے وسیلے سے ہوا تھا۔ اکرام چغتائی کے مقالے میں اقبال اور جرمنی کے تعلق سے کئی باتیں بالکل نئی تھیں۔ مقالے کو بہ نظر استحسان سے دیکھا گیا۔ اس کے بعد حسب دستور سوال و جواب اور وضاحتیں۔

مادام شمل آج بعد دوپہر' واپس جرمنی روانہ ہونے والی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اس نشست کے آخر میں ایک طرح سے الوداعی (اور صدارتی) تقریر کی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ باوجود اس لمبی نشست کے' حاضری بھرپور تھی۔ طلبہ و طالبات نے توجہ اور دل چسپی سے شمل کی باتیں سنیں۔ ریاض محمد خاں صاحب نے مقالات کے بارے میں اظہار خیال کیا' خصوصاً خالد احمد کے خیالات سے متعلق کچھ وضاحتیں۔ آخر میں سفیر صاحب نے اس امید کا اظہار کرتے ہوئے کہ: Your Ishq with Pakistan will continue' شمل صاحبہ کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

علامہ اقبال اور اس واسطے سے پاکستان کو مغربی حلقوں میں متعارف کرانے میں شمل کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۹۵ء میں جرمن بک ٹریڈ ایسوسی ایشن کی طرف سے پروفیسر شمل کو امن انعام دینے کا فیصلہ ہوا تو جرمنی اور یورپ کے ابلاغی حلقوں اور

مصنفین کی صفوں میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ شمل کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ (شمل کو دھمکیاں بھی دی گئیں اور ان دنوں وہ خاصی پریشان رہیں۔) صدر جرمنی رومن ہرزوگ پر بھی نکتہ چینی کی گئی کیوں کہ وہ انعامی تقریب میں شریک ہو کر بہ دست خود شمل کو انعام دینے والے تھے۔ بعض سیاسی پارٹیوں نے تو صدر کے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا۔[۱۱] اس مخالفت کا ایک سبب یہ تھا کہ شمل نے سلمان رشدی کے معاملے میں اہل مغرب کے حسب توقع بیانات دینے سے انکار کر دیا تھا' دوسرے یہ کہ مخالفین کے خیال میں شمل' اپنی تحریروں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہنچاتی رہی ہیں۔ بہ ہر حال شمل کو امن انعام دینے کی تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر جرمن صدر رومن ہرزوگ نے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

جب تک میں نے ڈاکٹر شمل کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا' اس وقت تک میں ماضی اور حال میں اسلام میں ابھرنے والی تحریکوں کے حیران کن اور دم بخود کر دینے والے پہلوؤں سے ناآشنا تھا۔ ممکن ہے آپ میں سے کچھ لوگوں کا بھی یہی تجربہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کو دوسروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہییں اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم اسلام کی متنوع اور حیران کن تحریکوں کو نظرانداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے ہمیں اسلام کو محض روایتی اور قدامت پسند قرار دے کر سیاسی بنیاد پرستوں کا کام آسان نہیں بنانا چاہیے۔ اگر ہم واقعی انسانی حقوق اور جمہوریت کا سنجیدگی سے تحفظ کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ ہم عالم اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگہی حاصل کریں۔

میرے پاکستان کے دورے میں بین الثقافتی ترجمان کی حیثیت سے وہ کتنی کامیاب رہیں۔ میں نے اپنے دورے میں جتنے لوگوں سے گفتگو کی' اس دوران ڈاکٹر شمل کی وجہ سے میرے لیے مسلمانوں کے دل کھل گئے۔ ڈاکٹر این میری شمل نے ہمارے لیے اسلام کے بارے میں جاننے کی راہ کھول دی ہے۔[۱۲]

۶

ایک سے دو بجے تک کے وقفے میں بوفے کھانا' باتیں' تصویر کشی اور سگریٹ نوشی--- (ہال میں تمباکو نوشی ممنوع تھی)۔ سید حسن جاوید نے بتایا تھا کہ ہم نے ہوٹل میں اور یہاں بھی خاص ہدایت کی ہے کہ "مسلم فوڈ" کا اہتمام کیا جائے' پھر بھی ہم دیکھ بھال کر ہی کچھ کھاتے پیتے۔ بالعموم خشک ڈبل روٹی' پنیر یا مکھن اور جیلی اور اس کے ساتھ چائے یا کافی۔

وقفے کے بعد' دو بجے ریاض محمد خاں صاحب کی صدارت میں آخری علمی نشست کا آغاز ہوا۔ سفیر صاحب نے اقبال اکادمی پاکستان کے ناظم جناب محمد سہیل عمر کو' ان کے گریز کے باوجود' اپنے برابر مہمان خصوصی کی نشست پر بٹھایا۔ پہلا مقالہ لووین یونی ورسٹی کے پروفیسر وان ٹونگرلو کا تھا: Iqbal's Concept of Self Identity--- اس نشست کے ایک مقالہ نگار جناب صبری تبریزی گذشتہ روز مقالہ پیش کر چکے تھے۔ دو مقالہ نگار جناب فرانس لاماں' (موضوع مقالہ: Iqbal and West) اور پروفیسر ایمی لو پلاٹی' (موضوع مقالہ: Maududi and Iqbal) اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر شرکت سے معذور رہے' اس لیے اب صرف دو مقالے باقی تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے مقالے کا عنوان تھا:

Man versus Universe: Iqbal's Perception

فراقی صاحب کا کہنا تھا کہ خدا' انسان اور کائنات کی مثلث میں انسان خدا کے ماتحت ہے اور کائنات انسان کے تصرف میں ہے۔ کش مکش زیست میں انسان کی حیثیت ایک ایسے فعال عنصر کی ہے جو کائنات کو بناتا اور سنوارتا ہے مگر اس کی آزادی کا مطلب ذات حق کی آزادی کی تحدید نہیں۔ اقبال کا انسان امید' آرزو اور تسخیر کائنات کی جیتی جاگتی علامات ہے۔ وہ میتھیو آرنلڈ کا ایمپی ڈوکلیز نہیں جس کی مایوسی اسے ایٹنا کے آتش فشاں میں کود کر خودکشی پر مجبور کر دیتی ہے۔ فراقی صاحب نے اقبال کی شاعری اور ان کی نثری تحریروں کی مدد سے اقبال کے تصورات انسان و کائنات کو بڑی خوبی سے واضح کیا تھا۔ انھوں نے اپنے مقالے کو اقبال کے اس حیات بخش خیال پر ختم کیا کہ انسان کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے: کائنات کی روحانی تعبیر' فرد کی روحانی آزادی اور آفاقی نوعیت کے

اصولوں کی توضیح و ترویج۔ مقالے کے مفاہیم اور مقرر کے طرز ادا کو سراہا گیا۔
اور سب سے آخر میں راقم الحروف نے:
The Relevance of Iqbal's Thought in the Modern World
کے عنوان سے کچھ گزارشات پیش کیں۔ راقم کے خیال میں عہد اقبال میں، برعظیم اور عالم اسلام، بلکہ پوری انسانیت، تمدنی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی اعتبار سے ایک شدید اور ہمہ گیر آشوب کا شکار تھی (اور علامہ اقبال کو اس کا بہ خوبی ادراک تھا)۔ اقبال نے بعض تصورات (خودی، عشق، فقر، مرد کامل وغیرہ) پیش کیے، جن کی معنویت، ان کے عہد تک محدود نہیں رہی۔ اقبال نے خود کو مستقبل کا شاعر کہا ہے چنانچہ ان کا زندہ و توانا فکر، جدید دنیا کی الجھی ہوئی صورت حال میں بھی بہت بامعنی اور موثر نظر آتا ہے۔ اقبال ہمیں خدا، کائنات اور اپنی ذات پر اعتماد، عرفان نفس، ایمان و ایقان، دولت اور وسائل کی منصفانہ تقسیم، فقر و درویشی اور امومت پر کاربند ہونے کی تلقین کرتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ صرف اسی صورت میں ہمیں باطن کی وہ روشنی میسر آ سکتی ہے جس سے تاریکی کافور ہو اور زندگی کے سارے راستے منور ہوتے چلے جائیں۔

جناب ریاض محمد خاں نے حسب روایت، مقالوں کے بارے میں سامعین کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ بہ طور خاص انھوں نے مادام پری گارینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آخری مقالے میں امومت کے مسئلے پر اقبال کا جو موقف پیش کیا گیا ہے اور عصر حاضر میں، خصوصاً مغرب اور یورپ میں، خواتین جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس کی روشنی میں، آپ قبال کے نقطۂ نظر کو کس حد تک درست سمجھتی ہیں یا اس بارے میں آپ کا اپنا موقف کیا ہے؟ مگر پری گارینا نے اس پر جو کچھ کہا، اس سے اندازہ ہوا کہ امومت کے بارے میں اقبال کا تصور، پوری طرح ان کی گرفت میں نہیں ہے اور مغرب میں امومت سے گریز کے نتیجے میں، جو معاشرتی ابتری اور تمدنی انتشار پیدا ہوا ہے، وہ بھی غالباً ان کے نزدیک اس قدر اہم نہیں ہے۔

سفیر پاکستان نے مقالات کے معیار کو قابل تعریف قرار دیتے ہوئے کہا کہ نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود، اقبال کے فکر کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری رہنا

چاہیے۔ انھوں نے آخر میں پھر مقالہ نگاروں کا، منتظمین کا اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا کہ ان سب کے تعاون ہی سے یہ سمپوزیم کامیاب ہوا۔ جناب خالد احمد نے مندوبین کی جانب سے سفیر پاکستان، گینٹ یونی ورسٹی، پروفیسر فرمیولین، ڈاکٹر درانی اور دیگر متعلقین کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر صبری تبریزی نے اپنے جذبات کا اظہار فارسی نظم کی شکل میں کیا (اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی سنایا)۔

سمپوزیم کے اختتام پذیر لمحوں میں پروفیسر فرمیولین خاصے مسرور نظر آ رہے تھے۔ گزشتہ شب کے عشائیے میں انھوں نے بعض مشکلات کا ذکر کیا تھا، لگتا تھا کہ اب وہ تلخی کافور ہو چکی ہے۔ کہنے لگے: اگر کہا گیا تو میں دوبارہ ایسا ہی سمپوزیم منعقد کروں گا۔

ساڑھے پانچ بجے یونی ورسٹی سے باہر نکلتے ہوئے پروفیسر فرمیولین نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ اور پرجوش مصافحے کے ساتھ مندوبین کو رخصت کیا تو گینٹ کی گلیاں اور سڑکیں روشن ہو رہی تھیں۔

گزشتہ بیس بائیس برس میں، راقم الحروف کو بین الاقوامی سطح کے آٹھ اقبال سیمی ناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے۔ یہ سمپوزیم نسبتاً خاموش، سنجیدہ اور باوقار تھا۔ مقالات کا معیار خاصا بہتر، اور سوال جواب اور مباحث بھی فکر انگیز تھے۔ اس نوع کے مذاکروں میں وقت کی قلت کے باعث ہر مقالہ نگار کو بالعموم پندرہ منٹ دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے مضمون کا ایک ناتمام سا خلاصہ پیش کر دے۔ گینٹ سمپوزیم کا قابل تعریف پہلو یہ رہا کہ ہر مقالے کے لیے نصف گھنٹہ مختص تھا، چنانچہ مقالہ نگاروں نے بہ اطمینان و دل جمعی مقالے پیش کیے۔ گو، بعض حضرات نے قدرے زیادہ وقت لیا، مگر بہ حیثیت مجموعی سب مقالوں کی پیش کش بہت عمدہ اور مناسب تھی، سوال جواب کے سلسلے اور بحث مباحثے نے سامعین کی دل چسپی بڑھا دی تھی۔ اس طرح یہ سیمی نار "افراتفری" کی اس کیفیت سے محفوظ رہا، جو کم وقت میں مقالہ نگاروں کی زیادہ تعداد کو بھگتانے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ سمپوزیم کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ لمبی نشستوں کے باوجود سامعین کی جانب سے بالعموم اکتاہٹ کا اظہار نہیں ہوا۔ جملہ

نشستوں کا آغاز و اختتام عموماً بروقت ہوا۔

۷

برسلز کے پاکستانی سفارت خانے کو میزبان کی حیثیت حاصل تھی۔ سفارت خانے نے اس حیثیت میں اپنے جملہ فرائض باوقار اور ذمہ دارانہ طور پر انجام دیے۔ بہ طور خاص' سفیر پاکستان کی دل چسپی اور "اقبال شناسی" مستحسن تھی۔ وہ سمپوزیم میں اول تا آخر شریک رہے اور دونوں دن عشائیوں کا اہتمام کر کے مندوبین کے ساتھ غیر رسمی ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع پیدا کیا۔ دونوں محافل شب بہت پرلطف رہیں اور آخر میں ہر روز "بین الاقوامی اردو مشاعرہ" برپا ہوتا رہا۔ اندازہ ہوا کہ ریاض محمد خاں صاحب شعر و ادب کا اچھا مطالعہ رکھتے ہیں۔

سمپوزیم میں پروفیسر شمل کی آمد و شرکت بھی سب کے لیے تقویت کا باعث ہوئی۔ انھوں نے ۱۹ برس کی عمر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ دنیا کی چھے یونی ورسٹیاں انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کر چکی ہیں۔ وہ فی البدیہہ تقریر کا عمدہ ملکہ رکھتی ہیں اور ان کی باتیں پرمغز اور قابل غور ہوتی ہیں۔ اس پیرانہ سالی (پ: ۱۹۲۲ء) میں بھی وہ ایسی مستعد اور فعال ہیں کہ بعض اوقات لمبے سفر کر کے مذاکروں اور سیمی ناروں میں شریک ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کی مختلف النوع علمی و تحقیقی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق' وہ کم و بیش تیس صفحات روزانہ لکھتی رہی ہیں۔[۱۳] ان کی موجودگی سے سمپوزیم کا اعتبار و وقار قائم ہوا۔

میرے ذہن میں بار بار ایک سوال پیدا ہوا کہ برسلز جیسے مرکزی مقام کو چھوڑ کر گینٹ میں سمپوزیم منعقد کرنے میں کیا مصلحت تھی؟ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا' اور سامعین و حاضرین میں طلبہ و طالبات کے علاوہ کوئی اِکا دُکا شخص ہی یہاں آیا ہو گا۔ بالکل "جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا" کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ پہلے روز پی آئی اے برسلز کے دو پاکستانی افسر اور ایک پاکستانی تاجر آئے ہوئے تھے۔ دوسرے روز بلجیم کی ایک خاتون نظر آئیں تو قدرے تعجب ہوا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ برسلز کے کسی ادارے

میں ملازم ہیں۔ کچھ عرصہ پاکستان میں مقیم رہی ہیں' اردو جانتی ہیں اور وہ برسلز میں مقیم ایک پاکستانی تاجر کی بیگم ہیں۔ دراصل اس سمپوزیم کے حقیقی سامعین خود مقالہ نگار و مندوبین ہی تھے۔ وہاں ہم نے یہ سنا کہ برسلز میں مذاکرہ منعقد کرنے میں کئی طرح کی مشکلات درپیش تھیں۔ اس مذاکرے کی کوئی خبر' یا روداد کسی اخبار میں چھپی ہو؟ ہمیں نہیں معلوم کیوں کہ کوئی اخبار نویس نظر نہیں آیا۔ البتہ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اس کی وِڈیو بنانے کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے لیے ان کے دوست جناب مصطفیٰ علی خاں برطانیہ سے آئے ہوئے تھے۔ سمپوزیم کے اس پہلو کے تذکرے سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس موقع کو یورپ کے اس مرکز میں' اقبال کے وسیع تعارف کا ذریعہ بنایا جاتا تو اس سے دیارِ مغرب میں مطالعہ اقبال کی مزید راہیں کھلتیں۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب اور معیاری سمپوزیم تھا۔

پیر' ۲۰ نومبر کو دن کے دس بجے تھے۔ ہم گینٹ سے روانہ ہو رہے تھے۔ آسمان پر گہرا ابر چھایا ہوا تھا اور ہلکا ہلکا ترشّح بھی ہو رہا تھا۔ اِبِنْ ہوٹل سے نکلے تو اس کے بالمقابل واقع ایک قدیم گرجا پر نظر پڑی۔ ایک بار پھر علامہ کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو گیا:

دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

گینٹ سے برسلز کی طرف آتے ہوئے' خیال آ رہا تھا کہ یورپ میں کم از کم دو بار بین الاقوامی اقبال کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ (قرطبہ: ۱۹۹۱ء' گینٹ ۱۹۹۷ء)۔ کیا افریقہ یا شرق اوسط کے صحراؤں میں بھی (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جہاں اُمِّ کلثوم کے گائے ہوئے کلام اقبال پر سر دھننے والوں کی کمی نہیں' اور جہاں اقبال کی شخصیت یا ان کے فکر سے واقفیت رکھنے والوں کی معتدبہ تعداد بھی موجود ہے) کبھی اذان اقبالیات کی صدا سنائی دے گی؟

(اقبالیات' لاہور' جنوری ۱۹۹۸ء' نظرثانی اور اضافہ: مئی ۱۹۹۹ء)

حوالے اور حواشی

۱۔ تراجم کی تفصیل راقم کی مرتبہ: **کتابیات اقبال** (لاہور، ۱۹۷۷ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب، غیر معمولی اضافوں کے بعد دوبارہ اشاعت کے لیے تیار کی جا رہی ہے--- نیز دیکھیے: شازیہ ظہیر خواجہ کا ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ: **کلام اقبال کے تراجم کا توضیحی اشاریہ**، شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۲۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر سعید اختر درانی، کی تصانیف: **اقبال یورپ میں** (لاہور، طبع دوم: ۱۹۹۹ء) اور **نوادر اقبال یورپ میں** (لاہور، ۱۹۹۶ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۳۔ اس مشاورتی اجلاس کی روداد راقم نے اپنے "سفرنامہ اندلس" (**نقوش**، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۱۴) میں بیان کی ہے۔ توقع ہے کہ مذکورہ سفرنامہ "**پوشیدہ تری خاک میں.....**" کے نام سے، جلد شائع ہو جائے گا۔

۴۔ شہاب الدین انصاری نے شمل کے کسی مضمون کا اردو ترجمہ "تلاش علم کی لذت" کے عنوان سے **جامعہ** دہلی (مارچ، اپریل ۱۹۹۴ء) میں شائع کرایا تھا، یہ اقتباس اسی ترجمے سے لیا گیا ہے۔

۵۔ **فہرست مشمولات آثار علامہ اقبال** (شائع کردہ محکمہ آثار قدیمہ حکومت پاکستان، ۱۹۸۳ء) میں، اس کا اندراج، بہ این الفاظ ملتا ہے: "**پیام مشرق** سے ماخوذ اقبال کی نظموں کے جرمن تراجم، جھلی نما کاغذ پر لکھے ہوئے سترہ ورق (لپٹے ہوئے)" (ص ۱۱۷، حوالہ ۴۔ (۹۲))۔

۶۔ کتابیات اقبال کے منصوبے میں پیش رفت کی کوئی خبر، ابھی تک سننے میں نہیں آئی۔

۷،۸۔ **نوائے وقت** لاہور، ۲۸ نومبر ۱۹۹۵ء۔

۹۔ اقبال نے، ۱۹۳۲ء کے ایک خط بنام ویگے ناست میں لکھا تھا: "جرمنی، میرے لیے ایک طرح سے، دوسرا روحانی وطن تھا"--- (**اقبال یورپ میں**، طبع دوم، ۱۹۹۹، ص ۲۱۵)۔

۱۰۔ یہ بات محل نظر ہے کیوں کہ متعدد اصحاب نے عطیہ فیضی کے بیانات پر گرفت کی ہے، مثلاً: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: **عروج اقبال** (بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲۱ تا ۳۲۸)۔

۱۱۔ The Mission، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۷۔

۱۲۔ ماہنامہ **معلومات جرمنی**، اسلام آباد، جون ۱۹۹۶ء، ص ۸۔

۱۳۔ اقبال اکادمی پاکستان نے ۱۹۹۸ء میں تصانیف شمل کی ایک کتابیات شائع کی تھی، اس کے دیباچے

سے پتا چلتا ہے کہ محترمہ شمل کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ مضامین و تبصرے اس کے علاوہ ہیں۔ ان کے ایک شاگرد پروفیسر بیورگل نے، انھیں پیش کردہ ایک ارمغان علمی (۱۹۹۴ء) میں انھیں writing machine قرار دیا تھا۔ شمل کو فروری ۱۹۹۸ء میں، لاہور میں منعقدہ ایک تقریب میں، پہلا بین الاقوامی صدارتی اقبال اوارڈ اور سونے کا تمغا پیش کیا گیا۔ ان کے تعارف اور علمی کارناموں کے لیے دیکھیے: متذکرہ بالا کتابیات، خصوصاً اس میں شامل مضمون از جناب محمد اکرام چغتائی۔